ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

ذکرِ وفکرِ اکبر الہ آبادی

مصنف

عبد الماجد دریابادی

مرتب

حبیب احمد قدوائی

تعداد . . . . چھ سو ۶۰۰

بار اول . . . . سنہ ۱۹۸۸ء

پبلشر مرتب . . . . حبیب احمد قدوائی

پرنٹر . . . . سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت . . . . تیس روپے

کتاب ملنے کے پتے

دانش محل امین آباد پارک لکھنؤ

اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ

انتساب

عمِّ محترم
جناب مولانا
عبدالماجد دریابادی مرحوم
کے
نام

فہرست مضامین

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش

کے

مالی اشتراک

سے

شائع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

کہاں سنہ ۲۱ء کہاں سنہ ۵۲، ۱۹۵۱ء ۳۰ - ۳۱ سال کی مدت کچھ تھوڑی ہوتی ایک جگ بیت گیا۔ ایک قرن گذر گیا جو بچہ تھا جوان ہو گیا۔ جوان بڑھاپے کو پہونچ گیا اور جو بوڑھا تھا وہ اسی عالم سے ہی سفر کر گیا۔ کیا کیا انقلابات خارجی اور مادی، دماغی و روحانی اس درمیان میں ہر قسم کے آئے اور اپنا کام کر گئے لیکن اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو جو عقیدت حضرت اکبر اور ان کے کلام سے سنہ ۲۱ء میں ان کی وفات کے وقت تھی اس میں آج تک ایک ذرہ کی کمی نہیں عجب نہیں کہ کچھ اضافہ ہو گیا ہو۔ پہلا مفصل تبصرہ ان کے کلام پر آخر سنہ ۲۱ء میں لکھا تھا جو اپریل سنہ ۲۲ء کے رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو) میں نکلا تھا۔ اور اب پھر ایک ذرا بڑا سا تبصرہ ان کے پرانے کلام کلیات اول کے نئے ایڈیشن پر آخر سنہ ۵۱ء میں کر رہا ہوں۔ آہ مرحوم ستمبر میں اللہ کو پیارے ہوئے تھے اتفاق سے یہ سطریں بھی ستمبر کے مہینہ میں سپرد قلم ہو رہی ہیں۔

اس درمیان میں بار بار ان پر لکھنا لکھانا ہوا۔ کبھی ریڈیو پر بولنا ہوا کبھی یوم اکبر پر کوئی پیام نشر کرنا ہوا گو کم فرصتی یا کم ہمتی ہمیشہ ہی دامنگیر رہی اور دل کھول کر کبھی ایک بار بھی لکھنا نصیب نہ ہوا۔ ارادہ اور حوصلے شروع شروع بہت بلند تھے اور ہمت یہ تھی کہ ان کے ایک ایک صنف کلام پر تفصیل سے لکھا جائے گا اور تغزل، سیاست، ظرافت، فلسفہ، معرفت غرض ان کے ایک ایک میدان کی تفصیلی سیر کی جائے گی۔ زمانے نے کبھی مساعدت

نہ کی یا صحیح طور پر یہ کہئے کہ کاہلی اور کام چوری نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا اور کتنی باتیں جو کہنے والی تھیں ان کہی رہ گئیں اور اب وہ کم عمری والی فرصتیں اور مہلتیں لائی جائیں تو کہاں سے؟

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دل برابر فکرمند اور ملول رہتا تھا کہ حشر میں جب حضرت اکبر کا سامنا ہوگا تو اس وقت کیسی شرمندگی ہوگی اور اس قرضے کے نہ چکا سکنے کی بات کیا بنے گی.. اتنے میں خبر مسرت اثر معلوم ہوئی کہ حضرت اکبر کے شہر الہ آباد سے بہت دور بلکہ ایک دوسرے ملک میں بزم اکبر کے نام سے ایک ادارہ کلام اکبر اور تعلیمات اکبر کے احیاء و نشر و تبلیغ کے لئے قائم ہوگیا ہے. خدا فراموشی کی اس فضا میں بھلا کسی کو بھی یہ توقع ہو سکتی تھی کہ یادگار ایک اردو شاعر اور پھر ایک ایسے خدا پرست شاعر کی قائم ہو سکے گی! اکبر نے تو اپنے ہی زمانے میں حیرت و استعجاب کے لہجہ میں کہا تھا. ع

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

چہ جائیکہ اب ۴۰، ۵۰ برس اور ادھر ہٹ کر!

یہ مجموعہ تیار ہو کر ابھی روانہ ہی ہو رہا تھا کہ معلوم ہوا. آں قدح بشکست وآں ساقی نماند. وہ بزم ہی سرے سے ٹوٹ گئی. انا للہ. مردہ سینہ کے لئے بار بنا ہوا تھا کہ لکھنؤ کے ایک ناشر ہمت کرکے آگے بڑھے اور یہ اوراق طبع اول کے لئے ان کے سپرد کئے جا رہے ہیں. یہ ناشر صاحب بڑے تاجر نہیں اردو کے مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی مرحوم کے پرپوتے اور صاحب نور اللغات نور الحسن کاکوروی مرحوم کے پوتے ہیں اور اس لئے ارشعر و ادب کی خدمت کا حق موروثی رکھتے ہیں.

یہ مضمون مقالے اور شذرے زیادہ تر اپنے ہی ہفتہ وار پرچہ صدق سے منقول ہیں۔ ایک بڑا مضمون انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو سے ایک مضمون علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر سے اور دو ریڈیو کے نشریہ ہیں۔ جو تحریریں ۳۰ سال کے وسیع رقبہ میں پھیلی ہوں اور اکثر ایک دوسرے سے مختلف موقعوں کے لئے لکھی ہوں ان میں ہم آہنگی اور یکسانی پیدا کرنا آسان نہیں۔ یہ خصوصیت تو صرف ایک مرتب کتاب ہی کی ہوتی ہے تاہم ان منتشر تحریروں پر نظر ثانی خاص اسی مقصد کے لئے کر لی گئی ہے کہ تناقضات حتی الامکان رفع کر دئے جائیں مکررات کم سے کم رہ جائیں اور طرز عبارت دونوں کے لحاظ سے پرانی اور ابتدائی تحریریں آخری اور حال کی تحریروں سے قریب قریب آجائیں۔

پڑھنے والوں کو ان صفحات میں اگر کہیں کوئی خوبی نظر آئے وہ حضرت اکبر کی روحانیت کی برکت اور ان کا فیض تصور فرمائیں اور جن کی باتیں ناپسند ہوں انھیں بے تکلف اسی ہیچمداں کے نامہ اعمال میں ڈال دیں۔

عبدالماجد۔ دریاباد۔ بارہ بنکی۔

تحریر اول ۱۹۵۱ء

نظر ثانی اپریل ۱۹۵۲ء

مجھے کہنا ہے اپنی زبان میں

عرضِ مرتب

مندرجہ بالا دیباچہ سیر حاصل ہے۔ مرتب کو اپنی زبان میں صرف یہ عرض کرنا ہے

(۱) سابقہ مشمولات کے ساتھ "ذکر و فکر اکبر الہ آبادی"، "اکبر نامہ" یا "اکبر میری نظر میں" (مطبوعہ ۱۹۵۴) کا نقش ثانی ہے۔

(۲) نئے مندرجات یہ ہیں۔

(۱) الہ آباد کا ایک بڑا شاعر (صدق لکھنؤ بابت ۱۹۶۴م

(۲) اکبر الہ آبادی (معاصرین)

(۳) مختصر حالات زندگی۔ (از مرتب)

حبیب احمد قدوائی مرتب
تاریخ ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۸۶ء
خاتون منزل حیدر مرزا روڈ
لکھنؤ

پیامِ اکبر

یعنی

حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیات سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل و
نظیر کہیں مدتوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات یک طرف شوخی و زندہ دلی اور دوسری
طرف حکمت و روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی۔ یا یوں کہیئے کہ ایک طرفہ معجون آخر آخر نہ
ان کی شاعری شاعری رہی تھی۔ نہ ان کا فلسفہ فلسفہ۔ ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود
حکمت و معرفت کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جامع تھی ادب حکمت و ظرافت
کی ان کی صحبت ایک زندہ درسگاہ تھی۔ تصوف اسرار شریعت و معرفت کی وہ چند معمولی
فقروں میں وہ نقطے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے اور
[illegible] ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے جو سالہا سال کے مطالعے سے بھی
حل نہ ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنھیں انکی خدمت میں نیاز مندوں کا شرف حاصل
تھا۔ جن کی رسائی اس چشمۂ حیات تک نہ ہو سکی انھیں آج اپنی نارسائی، محرومی پر
حسرت ہے اور جن کی ہو چکی تھی انھیں یہ حسرت ہے کہ وہ اور زیادہ سیراب کیوں
نہ ہوئے۔

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد[1]

اکبر کے مجموعہ کلام پر تفصیل تبصرہ کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چھپا ہوا کلام اس وقت تک[2] تین جلدوں میں ہے اور جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے وہ بھی اتنا ہے کہ اگر دو جلدوں میں نہیں تو ایک کے لئے بالکل کافی ہے۔ رسالہ[3] کی محدود میں اس سارے ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف اس حصۂ کلام پر نظر کی جائے گی جو انھوں نے تقریباً سنہ ۱۹۱۴ء سے لے کر آخر ۱۹۱۹ء تک فرمایا۔ اس دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتدبہ ذخیرہ کلام اس کے بعد کا ہے۔ یعنی سنہ ۱۹۲۰ء سے لے کر عین وفات ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء تک کا۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہو جائے لیکن ابھی کہ مرحوم کی وفات کو ۲۳ سال گذر چکے ہیں۔ شعروں کی حالت میں ہے اور مسودہ بھی شاید پورے طور مرتب نہیں۔

---

[1] یہ مضمون وفات اکبر دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کے دو ہی چار مہینے بعد قلمبند ہوا ہے اور پہلی بار انجمن ترقی کے مشہور رسالہ اردو (جو اس وقت اورنگ آباد سے نکلتا تھا) کے دو نمبروں میں اکتوبر ۱۹۲۲ء، اپریل سنہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ نظر ثانی سنہ ۱۹۴۴ء میں ہوئی اور نظر ثالث وسط سنہ ۱۹۵۱ء۔

[2] یعنی سنہ ۱۹۲۲ء تک۔

[3] شائع شدہ کی قید بہت پر معنی ہے۔ حضرت اکبر بڑے ہی پر گو بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کر جاتے اور شعر کہتے جاتے لیکن کلام کا ایک قاصد حصہ ایسا بھی ہوتا جب صرف نجی محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخلص دوستوں ہی کو سناتے عام اشاعت کے روادار اس حصہ کلام کے کسی حال میں بھی نہ ہوئے۔

بہتر ہوگا کہ ان کی شاعری کو مختلف صنفوں میں تقسیم کرکے ہر عنوان پر نظر ثانی کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے ہیں جو پہلے ایک عنوان کے تحت میں آئیں گے اور بعد کو دوسرے کئی مختلف اور پہلوؤں سے اس میں بار بار لانا پڑے گا اور تکرار یہاں بخشی کسی حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبر کی کتاب شاعری کے پانچ مستقل باب آسانی قرار دے جاسکتے ہیں:۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی

(۲) سیاسیات

(۳) عشق و تغزل

(۴) اخلاق و معاشرت

(۵) تصوف، معرفت و فلسفہ (اور جی چاہے تو اس ایک عنوان کے بھی دو حصے کرلیجئے فلسفہ الگ تصوف الگ۔ ان میں سے ہر عنوان پر ایک ایک کرکے گفتگو مناسب ہوگی۔

ظرافت و زندہ دلی

اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی۔ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا ہندستان میں

۱؎ یعنی وہی رسالہ اردو

۲؎ یعنی ۱۹۴۷ء

آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے۔ اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہو۔ قوم نے ان کو جانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے پھولوں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے ان کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے لیکن جس زمانہ کے کلام پر یہاں خصوصیت کے ساتھ تبصرہ مقصود ہے۔ یہ زمانہ ان کی ظرافت کے شباب کا نہ تھا جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بننے لگا اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی اور صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا۔ سوزش عشق نے سینہ کو گرمایا۔ ذوق عرفان نے دل کو تڑپایا اور معرفت کی شعاعیں ان کے مطلع قلب سے اس نورانیت کے ساتھ چھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھوں کو قریب تھا کہ چکا چوند لگ جائے یہی تو بات ہے کہ کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید دس فیصدی بھی نہ نکلیں[1] حالانکہ کلیات اول و دوم ظریفانہ اشعار کا تناسب ۳۰ فیصدی سے کسی حال میں بھی کم نہ تھا۔

لیکن ہے کہ اقسام ازل نے ذہانت و فطانت، شوخی و زندہ دلی کی

---

[1] کلیات سوم میں کلام ۱۹۱۴ء تا 1919 کا کلام درج ہے۔ حضرت اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ تھا اس حساب سے اس وقت سن ۶۸ یا ۷۳ سال تھا۔

تقسیم میں ان کے لیے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا اس لیے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف صدمات اور خانگی مصائب کے ہجوم[1] اور دوسری طرف دینداری و تصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پائے۔ شمع جھلملا ضرور رہی تھی مگر بجھی نہ تھی آفتاب ڈھل بے شک چکا تھا۔ زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے ساتھ اور اس ندرت کے ساتھ کہ دیوان پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے والے ششدر رہ جاتے تھے۔ کلیات سوم میں اس کے نمونے بیشتر کے مقابلے میں یقیناً کمتر لیکن پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔

اکبر ظریف تھے، ہزال و فحاش نہ تھے۔ دلوں کو خوش کرتے تھے۔ چہروں پر تبسم لاتے تھے جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہیں کرتے تھے ان کی ظرافت پھکڑ اور ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی اور محاورہ لفظی مناسبت، ترکیب کی ندرت قافیہ کی جدت کے زور سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں پھیلانے میں محتاط تھے قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے تھے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی تھی۔ اور جو اتنے معتقد اور باادب نہ تھے وہ تو جھنجھلاہٹ میں حضرت اکبر کو خدا جانے کیا کچھ کہہ

---

[1] حضرت اکبر کے دو محل تھے۔ زوجہ اولیٰ سے شروع ہی سے تعلقات بہت تلخ رہے زوجہ ثانیہ محبوبہ خاص تھیں انھوں نے ۱۹۱۰ء میں رحلت کی چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم محبوب تھے ۱۲ سال کی عمر میں ۱۹۱۳ء میں انھوں نے داغ مفارقت دیا بعض اور خانگی صدمے ان کے علاوہ تھے پر حضرت اکبر تھے ہی بڑے حساس طبیعت کے ہر حادثہ سے متاثر زائد ہوتے تھے۔

سن ڈالتے تھے۔ خیر ظرافت۔ اس خاص غرض یعنی ستر حال کے لئے۔ اخفائے خیال کے لئے ان کے ہاتھ میں اچھے لفافہ کا۔ بڑے کار آمد آلہ کا کام دیتی تھی اور جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردے میں سنا جاتے۔ کچھ انکی سیاسیات پر موقوف نہیں۔ رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عاصی، "صاحب" اور "نیو" ہندو و مسلم، سنی و شیعہ سب کی صحبت میں آمد و رفت رکھتے اور مسجد اور مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ کاونسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے ایک ایک چہرے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے اسے بھانپتے اسے تاکتے۔ کسی کو جانچتے کسی کو بھانپتے تجھ کو تولتے مجھ کو ٹٹولتے لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب۔ بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گذرتے کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح لفظوں میں فرماتے ہیں ؎

دوستوں سے التجا ہے کریں اسکو معاف — خوش نصیبی ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
شاید معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لباس — سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار

موسم کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور ہواؤں سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔ وہ بھی آج (سنہ ۱۹۴۲ء) کی نہیں۔ آج سے ۳۰، ۳۵ سال قبل کی ان کی ظرافت کا بہت بڑا منظر یہ ہے سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں ان کا عمل عارف رومی کی اس تعلیم پر تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اکبر ان دلبران سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان کے اسرار کی منادی

وہ سر بازار کرتے لیکن زبان وہی اپنی مخصوص رکھتے۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہو گئے تھے وہ معنی مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے اور جو تہہ تک نہ پہنچتے وہ بھی بہرحال ایک دل لگی کی بات سمجھ کر ہنس تو پڑتے ہی تھے۔ "بت" "صنم" "مس" "شیخ" "سید" "سید صاحب" "اونٹ" "گائے" "کلیسا" "حرم" "دیر" "بتکدہ" "کالج" "برہمن" "لالہ" "صاحب" وغیرہ بیسیوں الفاظ نے لغات اکبری کہنا چاہئے کہ ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں۔ انھیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارے لئے ایک جال بچھا دیا ہے جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1] اور محکومی و تنزلی کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

ہاؤس تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالیسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت اسی پر مسرور ہو رہے ہیں
ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں

اس قبلۂ جماعت کا انتشار دیکھو
اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

ہے گا ملک دنیا کی ہسٹری میں[2]
اندھیرا ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

---

[1] کلیات اول میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎

تڑپو گے جتنا جال کے اندر
جال گھسے گا کھال کے اندر

[2] یعنی تاریخ لفظ "حسرت" کے لانے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ حسرت موہانی خود اس زمانے میں سیاسی لیڈروں کی صف اول میں تھے۔

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا روئے سخن بیشتر اپنی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیم اکبری کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اصلی الزام خود پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوئے ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ ہاون اگر نہ ہو تو دستہ چلے کس پر؟

سرکاری مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی بھول بھلیاں کچھ ایسی ہی گئی ہیں کہ ہم ہمیشہ انھیں الجھاؤں میں پڑے رہتے ہیں اور "وہ عیش مناتے رہیں ہم ان کی کلرکی کی خدمت گذاری کی محنتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں اور وہ" آتا یا نہ" بے نیازیوں کے ساتھ داد عیش دیتے رہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

سمجھا رہے تھے مجھ کو فلک کی وہ گردشیں ——— خود کر رہے تھے تاک کی مٹی سے سازشیں

نقشہ میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام سے ——— میں نے کہا کہ حضور یہ مضمون عجیب ہے

رہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ ——— الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ

بولے کہ اس زمین میں کوئی شعر اور بھی ——— میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی

اللہ رے ارتقائے سگان در حضور ——— کل "تو" سے "تم" ہوئے تھے آج تم سے "آپ"

ہنس کر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق ——— گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

سرکار نامدار کے بعض نیک نام محکموں اور سررشتوں کی ذہانت و طباعی بلکہ قوت خلاقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے اور محکمہ پولیس کی کارگذاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار اس کے اسلاف صدہا برس یار کی کمر کو تلاش کرتے آئے ہیں آج تک پتہ نہ لگا خواجہ

۱؎ دمدار ستارہ (COMET)

خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی، معدوم کا پتہ اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے۔ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

ایسا ہونا اور نادر سرٹیفکیٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات ہی کے لئے مخصوص نہ تھا جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اصلاح، معاشرت، تعلیم کسی بھی شعبۂ حیات کے بڑے بڑے ثقہ و متین سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگے بغیر نہ چھوڑتے۔ اس وقت ملت پر جو فرنگی تہذیب و معاشرت کا جن مسلط ہے اس نے نوبت یہاں تک پہونچا دی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ حسن و عشق، عیش و عشرت سبھی کا معیار بدل گیا اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ پوری کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہوگئی ہے ؎

فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی
اب تو دھن ہے انھیں فرنگن کی

اور خیر ادھر طالب علموں، عاشقوں، شوریدہ سروں کا حال تو بدلا ہی تھا۔ کمال یہ ہوا کہ ادھر مطلوبوں، محبوبوں کی جماعت بھی "انقلاب زندہ باد" کی زد میں آجانے سے بچ نہ سکی۔ عشق کی وضعداری میں فرق آیا تو حسن کی طرحداریاں بھی کب اپنے رنگ پر قائم رہیں۔ بازار عشق میں چلن تمام نئے سکوں کا ہو گیا اور پرانے سکے ٹکسال باہر ہو گئے۔ اب تک مشرق نے اور مشرق کی شاعری نے حسن و جمال کا سب سے بڑا زیور شرم و حیا تمکین و حجاب کو سمجھا تھا لیکن

اب جو جاکر دیکھا تو محفل کا رنگ ہی بدلا ہوا۔ کیسی کم سخنی اور کہاں کی بے زبانی؟
مشق اب خطابت کی ہو رہی ہے۔ نہ وہ "نگاہ شرمگیں" نہ وہ "چشم سرمگیں"۔ اٹھی اور
پھٹی ہوئی نگاہیں اور چڑھی ہوئی نشیلی آنکھیں اب خود ہی دید و نظارہ کی مشتاق
چہرے پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کہانیاں
حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹا کر ڈرائنگ روم ٹھاٹھ محفل طرازی و بزم آرائی
کے جم رہے ہیں۔ عاشق صاحب اس انقلاب ماہیت پر دنگ رہ جاتے ہیں اور لکھتے
ہیں۔ ؎

اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں اسپیچ کا شوق — خامشی سے ہے تعلق نہ ہے تمکین کا ذوق
بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں — شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ مفہوم کو جتنی چاہے
وسعت دیتے چلے جائیے جن کو گوشہ نشین علمائے دین سمجھا جاتا تھا۔ وہ حجروں کی
چٹائیاں اور سجدوں کی صفیں لپیٹ: انکسار و تواضع، چھوڑ، پنڈال اور پلیٹ فارم
کی زینت بن گئے ہیں جو صوفی و مشائخ کہے جاتے تھے۔ خانقاہوں سے نکل انھوں
نے خوب اپنے نقارہ پر چوب لگانی شروع کر دی۔ دینی مدرسوں کے طلبا استادوں
کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے اسٹرائک اور مطالبہ حقوق کا بگل پھونکنے لگے
بیویوں نے شوہروں کی خدمت چھوڑ سینما اور تھیٹروں کا راستہ اختیار کیا۔ مائیں
بچوں کو آیا کے حوالے کر خود کلب جا پہونچیں۔ یہ سارے کا سارا مفہوم اس ایک بلیغ
مصرعہ میں سما گیا۔

ع بت اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں۔

اپنی دیسی تہذیب اور دیسی حکومت خواہ کسی ملت اور فرقہ کی ہو۔

اغیار کی حکومت اور دینی تہذیب سے تو بہر حال گوارا تھے[1]۔ اس مفہوم کو جس لذیذ و ذائقہ ــــ کنایات میں ادا کیا ہے۔ عجب نہیں کہ ان سے اہل ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے۔ ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا ایک دیہاتی
بسکٹ سے ملائم پوری ہو یا چپاتی

"پوری" اور "چپاتی" اور "بسکٹ" تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں۔ رہی "دیس کی دھن" تو ایک معنی اس کے ظاہری ہیں یعنی وطن کا جوش محبت باقی "دھن" اصطلاح موسیقی بھی ہے اور "دیسی" ایک راگ کا نام ہے اور یہ سارا راگ ایک دیہاتی یعنی عاصی کی زبان سے . . . نورؐ علی نور اس ردیف کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے۔

شان نماز اکبر تنہا نہ ہو چلی ہے — مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاقی

نماز باجماعت کی تو تاکید ہے ہی اس لئے کہ شاہ و گدا، آزاد و غلام، خادم و مخدوم ایک صف میں شانہ بشانہ کھڑے ہوں اور کم از کم اللہ کے گھر میں آکر تو دن میں پانچ مرتبہ یہ بندوں کے قائم کئے ہوئے امتیازات مٹتے رہے یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہو کر بھی اپنی آقائی و خواجگی کو نہیں بھولتے اور لفافی اور جمن بیچاروں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی الگ بنائیں۔

---

[1] خوش خیالیوں سے بھرے ہوئے یہ فقرے خواب خیال ہی رہے کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب خونیں سے سالہا سال قبل کے لکھے ہوئے تھے۔

ایک ذہنیت اس وقت[1] یہ چلی ہوئی تھی کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست فرنگی تہذیب فرنگی حکومت کو خوب برا بھلا کہا جائے لیکن انھیں حلقوں سے اگر کہیں واہ واہ ہونے لگے، شاباش ملنے لگے۔ داد و ستائش کی طرح پڑ جائے تو دل اس پر بھی خوشی سے اچھلنے لگتا ہو اور اندر ہی اندر لہر فخر و مسرت کی دوڑ جاتی ہے۔ اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی اس کی گرفت اپنے پنجۂ آہنی سے لگی۔ صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہو کہ فولاد کی صلابت و گرفتگی کس خوبی کے ساتھ نرم و گداز مخملی دستانے کے اندر غائب کر دی ہے

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم　　　　یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ

فلاں قومی شاعر کا خان بہادر ہو جانا، فلاں خادم ملت کا شمس العلماء بن جانا یہاں تک کہ اقبالؔ کا "سر" کے خطاب سے سرفراز ہو جانا۔ یہ سب مثالیں اکبری نظریہ کے مطابق اسی رقیب کے دئے ہوئے سرٹیفکٹ کی ہیں۔

ملت کے نوجوانوں مذہب سے جو بیگانگی ہے بعد و اجنبیت ہے۔ اس کو اکبر نے بڑی تکرار و کثرت سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں تو انداز ایسا لطیف اختیار کیا ہے کہ وہ ان کے سوا کسی اور سے بن ہی نہ پڑتا۔ دل کے آنسوؤں سے روتے جائیے لیکن چہرہ وہی ہنسی وہی تبسم کا بنائے رکھئے ارشاد ہوتا ہے۔

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے
پیری میں بھی اکبرؔ کی ظرافت نہیں جاتی

معاذ اللہ۔ بُعد و بیگانگی کی حد یہ ہے کہ عبادت کی کوئی سنجیدہ اہمیت ذہن

---

[1] زمانہ تحریر ۱۹۲۲ء

میں آ ہی نہیں سکتی اور اب جو کوئی تاکید کرتا ہے تو لا محالہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ بھی ایک اچھی دل لگی ہے۔

اب ملت کی مشغولیت کے سوا اس کے پاس باقی ہی کیا رہ گئی ہے کہ صلاح و فلاح کی حقیقی تدبیریں اور ان کی جانب توجہ غائب۔ آج یہ انجمن بنی۔ کل وہ مجلس، چندہ اس میں بھی دیجئے اور اس میں بھی اور ترقی کے بجائے سایہ ترقی کو کافی سمجھ لیجئے۔ ؎

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے ؎ ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جدید حریت مآبی، جدید تعلیم، جدید کمیٹی آفرینی اور جلسہ سازی حضرت اکبرؔ ان سب چیزوں کے قدیم مخالف تھے چندہ کا رواج نیا نیا انھیں کے زمانے میں نکلا تھا۔ اور خوب زور شور سے پھیل گیا تھا۔ اس لئے ان کے ترکش طنز کے تیروں کا بڑا ہدف بھی چندہ رہا کرتا تھا۔ ذیل کی مصوری ان کے نقطۂ خیال سے کتنی دلکش اور کیسی جامع ہے۔

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے
کالج کے چھوٹے لپٹے ہیں ٹیٹری کی ٹانگ سے
عالم رہیں چپ جو مستند و باوقار ہیں [1]
گو بجا ہوا پریس [2] ہے نفاقی کے سانگ سے [3]

---

[1] جس زمانے کا یہ کلام ہے علمائے دین بھی کثرت سے سیاسی اور وطنی تحریکات کے جزو بن کر ان میں گھل مل گئے تھے ایک حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مع اپنے مخصوص شاگردوں اور نائبوں کے اس طوفان سے الگ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے۔ اکبرؔ کا یہ اشارہ انھیں کی جانب ہے۔ [2] اخبارات، [3] راگ الگیت۔

نیت تو دنیا طلبی دو دنیا پرستی کی لیکن آڑ مذہب کی۔ مقصود و مطلوب دنیا لیکن زبان پر نام ہے دین و مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں اور ذرا دیکھئے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر صدا کیا لگاتے ہیں۔

کل کہتے تھے یہ بھائی گھورن — دنیا ہے روٹی، مذہب ہے چورن[1]

کھانا ٹھوس ٹھوس کر کھا لیا جاتا ہے تو آخر چورن کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ چورن کچھ دل مرغوب ہو مقصود تو وہی کھانا ہے لیکن کام بغیر چورن کے نہیں نکلتا ہے۔ اسی طرح مقصود تو وہی دنیا ہے لیکن آڑ مذہب کی۔

گئو رکھشا کی جدو جہد نئی پرانی ہے اور تحریک خلافت کے زمانہ میں یعنی سنہ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں تو قدرتاً اس کا زور بندھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں مسلمان اس معاملے میں ہندوؤں سے کچھ آگے ہی بڑھ چلے۔ اکبرؔ کا کہنا یہ ہے کہ خیر گائے کی جان بچی تو بچی۔ یہ بھی ایک سیاسی مصلحت تھی مصلحت نہیں ضرورت تک کہہ لیجئے لیکن آگے چلئے۔ اصل ضرورت تو مسلمانوں کو اپنے احکام دین و شعائر ملی پر توجہ کی تھی۔ تخیل کا یہ طیارہ ظرافت کی پھلجھڑی بن کر یوں پیش ہوا۔

بھوئیں جو گائے ماتا حسرت[2] سے اونٹ بولے

—— افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

اور یہ ترک ذبح بقر کا مسئلہ تو پھر بھی بڑا تھا۔ اکبرؔ کی نظر قومی و ملی زندگی کے چھوٹے موٹے جزئیات پر رہتی ہے۔ ایک روز مجلس میں یہ نامہ سیاہ حاضر تھا

---

[2] حسرت کا لفظ شعر میں بہت بلیغ ہے۔ حسرت موہانی اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علمبردار تھے۔

ارشاد یہ ہو رہا تھا کہ "صاحب" کی دیکھا دیکھی اب تو ہماری ہر چیز مجلس سازی اور انجمن سازی کی نذر ہے اتنے میں ذکر انجمن ترقی اردو کا نکل آیا۔ فرمایا۔ دیکھئے نہ زبان ہماری اپنی چیز تھی اب یہ ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اس کے لیے انجمن کھڑی کی گئی ہے جب ہی تو میں نے کہا ہے۔ ؎

ہم سے چھِن کر ہو گئی بزمِ ترقی کے سپرد
سچ کہا مرزا نے اب اردو بھی کورٹ ہو گئی[1]

حکومت کے دربار میں غیر کی کرسی حاصل کرنے کا جو ایک ہی طریقہ و تدبیر ہے سب پر روشن و عیاں ہے[2] لیکن اسے کھلے لفظوں میں کہدینا سب سے لڑائی مول لینا ہے۔ یہ اکبر کی زندہ دلی ہے جو اس تلخی میں بھی ایک شیرینی اور حلاوت پیدا کر دیتی ہے ؎

عقل نے اچھی کہی کل لالہ مجلس رائے سے
جھک کے ملنا چاہیے ہم سب کو وائسرائے سے

"صاحب" کے ہاں عزت پانے پر ان کے لئے "لالہ مجلس رائے" کیا خوب۔ اور

---

[1] لفظ "کورٹ" کو اس کے اردو تلفظ کے مطابق کورٹ (بروزن "موٹر") پڑھئے۔ انجمن ترقی اردو بطور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبہ کے قائم تو ایک عرصہ سے تھی لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی سکریٹری شپ کو ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا اور اس وقت سے بطور ایک مستقل ادارہ کے اس میں از سرِ نو جان پڑ گئی تھی۔

[2] یہ انگریزی دور کے اس زمانہ کا ذکر ہے جب آنریری مجسٹریٹی خان بہادری اور دوسرے خطابات اور تمغے خاص نشانات تقرب و اعزاز کے تھے۔

اس کا قافیہ وا نسرائے تو بہت خوب۔ عقل بمعنی مصلحت اندیشی اور لطف قافیہ کے لئے ساتھ کا دوسرا شعر بھی مُلاحظہ کیجئے۔ ؎

شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیہ اس کے ہیں خوب
کون ایسا ہے جو ہو مختلف اس رائے سے

تشبیہات کی ندرت اکبؔر کے نسخۂ ظرافت کا جزو اعظم ہے وہ وہ اچھوتی نادر و لطیف تشبیہیں اور کیسی کیسی پھبتیاں انھیں برجستہ سوجھ جاتیں جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کر بھی نہ آئیں۔ یہ ہم سب آپ ہی جانتے ہیں اور روزمرہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک طرف تو شوق "صاحبیت" کا فرنگیت کا سوار رہتا ہے دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ کچھ ذات برادری کا ڈر کچھ وضع کا پاس بھی چلے جاتا ہے غرض نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔ ایک مذبذب گومگو اور دو عملی کا عالم قائم کبھی چار قدم آگے بڑھے تو کبھی چھ قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کتر بیونت کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے جوڑ پھر بھی نہ ٹھیک بیٹھا۔ بقول شخصے نہ خدا کی یافت ہوئی نہ صنم کا وصال نصیب ہوا۔ ہنسے گئے بنائے گئے قہقہے ادھر سے بلند ہوئے تالیاں ادھر سے پٹیں۔ واقعت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی گلکاری ملاحظہ ہو۔ ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبر کے زمانے میں سینما کہاں تھا تھیٹر ہی سب کچھ تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لیے کسی ثقہ بزرگ کا بہ ایں جبہ و عمامہ تشریف لے جانا اور پھر اس کے لئے اونٹ کے سے مقدس جانور کا انتخاب جانِ بلاغت ہے۔ کیا کیا انگلیاں اٹھی ہوں گی جب حضرت سلامت کی سواری اس سج دھج سے اونٹ پر نکلی ہو گی۔

عام شاعروں پر قیاس کر کے لوگ اکبرؔ میں فرمائشی شاعری کی توقع
رکھتے تھے اور فرمائشوں کی بھرمار سے انھیں زچ کر دیتے تھے۔ آپ نے بھی
یہ کیا کہ ساری توقعات سارے تقاضوں کے جواب۔ بس ایک پرلطف اور اچھوتی"
تشبیہ پیش کر دی ؎

عشاق کو بھی مالِ تجارت سمجھ لیا
اس شہر کو ملاحظہ لِلّٰہ کیجئے

بھرتے ہیں میری آہ کو فوٹو گراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے [لہ]

اخباروں اور رسالوں کی طرف سے فرمائشوں کی حد ہی نہ تھی۔ اکبرؔ
کا نام چلا ہوا۔ شہرت بوئے گل کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی۔ ہر ایک یہی چاہتا کہ
اس شہرت و ناموری سے خوب فائدہ اٹھائے۔ اور اکبرؔ کے کلام کی چاٹ
دلا کر اپنی دکان کو خوب چمکائے۔ اکبرؔ کہاں تک سب کو خوش رکھتے اور پھر
پیرانہ سالی میں۔ مروت میں انکار بھی نہ کرتے بن پڑتی آخر ایک مرتبہ یہ شعر
چھاپ دیا۔ ؎

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے
ہمارے لختِ دل ہیں، آپ کا مالِ تجارت ہے

لہ حضرت اکبرؔ کے ایک عزیز کا بیان ہے کہ یہ نظم اس وقت کی ہے کہ جب
ایک انگریز افسر (مسٹر گوج پبلسٹی کمشنر) نے حضرت سے فرمائش کی تھی کہ تحریک ترک
موالات کے تردید میں کچھ کہیئے لیکن یہ روایت درایتہً علاوہ دوسری حیثیتوں کے
اس اعتبار سے بھی کمزور ہے کہ ترک موالات کا جب زور ہوا ہے اس وقت تک کلیات
کا یہ حصہ پریس میں پہونچ چکا تھا۔

یہ ضرور نہ تھا کہ تشبیہیں ہمیشہ نادر اور اچھوتی ہی ہوں۔ بعض بعض جگہ معروض و مانوس بلکہ پامال تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ مگر اس حسن وصنعت کاری کے ساتھ کہ اس تقلید پر جدتیں نثار ہو ہو جائیں۔ مشاطہ کا کمال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ساٹھ سال کی بوڑھی ڈھی توڑ پندرہ سال کی حسین و نوخیز لڑکی کی رعنائی، زیبائی، چلت پھرت پیدا کر دکھائے ـــــ بعض نامور استادوں کو دیکھا ہوگا کہ شعر میں مضمون پیدا کرنے سے تو کورے ہیں البتہ لفظی در و بست کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ محاورہ کوئی غلط بندھنے نہیں پاتا عروض کی لغزش قدم رکھنے نہیں پاتی متروکات کے ترک کا اہتمام رکھتے ہیں۔ بہلوئے دم پاس نہیں پھٹکتا۔ اکبر کے نگار خانے میں شبیہ ایسے حضرات کی ملاحظہ ہو۔ ؎

عشق کے معنی کے عالم تھے مگر عاشق نہ تھے

صورت عذرا سے واقف تھے مگر وامق نہ تھے

ایک دوسرا التعارف انھیں حضرات کا یوں کراتے ہیں ؎

صورت لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوان قیس

شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی نمونہ اوپر ہی ہے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں ایک اور ملاحظہ ہو۔ اردو کے رسم الخط کے دشمنوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کو گھسیٹ میں لکھا جاتا ہے کچھ اور پڑھا کچھ۔ یہ کہنا کچھ صدق دل سے نہیں تمام تر پروپگنڈا کے ماتحت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوناگری کی گھسیٹ تحریر اردو کے خط شکست سے کہیں زیادہ چوپٹ ہوتی ہے اور اس کی مضحکہ خیز مثالیں، عدالتی کارروائیوں، دستاویزوں وغیرہ کے حوالے سے اخباروں میں بارہا نکل چکی ہیں۔ اب دیکھئے اکبر کی نازک خیالی نے اس خشک حقیقت سے

کیا تر و تازہ مضمون نکال کھڑا کیا ہے ؎

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو
بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ بھی کام کی بات
بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

زمانہ کی ناقدری شاعری دنیا کا بڑا پرانا مضمون ہے سب ہی شاعر سامعین کی بدمذاقی کا رونا روتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہی صدائے درد جب چمنستان ظرافت کے اس عندلیب سے نکلتی ہے تو نغمۂ لطیف بن کر جلاتی ہے۔ ہنساتی ہے اور چٹکی کو گدگدی میں تبدیل کر کے رہتی ہے۔ ؎

قدردانوں کی طبیعت کا عجیب رنگ ہے آج
بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ ہم الو نہ ہوئے

اردو دانوں، اردو خوانوں، اردو نویسوں کی بزم میں مرحبا اور سبحان اللہ کی کیا کمی ہے۔ تحسین کے وہ غلغلے نہ آفرین کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج جائے ___ در و دیوار جنبش میں آ جائیں لیکن لفاظی کے شور و ہنگامے کے آگے بس خلا ہی خلا۔ بڑی سے بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپائیے۔ اس کے بعد خود اپنے ہاتھ سے مسودہ صاف کیجئے، مطبع والوں کے دروازوں پر دستخط دیجئے۔ ان کے سارے نخرے برداشت کیجئے۔ وعدے وہ صبر آزما کہ پریس کے شکنجے میں اوراق کے کتاب کے ساتھ ساتھ گویا مصنف کی روح بھی دبی گھٹی جا رہی ہے، اور جب کتاب پریس سے باہر آئے تو خود ہی اشتہار لکھئے اور پھر جس طرح کتاب لکھی گئی و بالقلم خود، یعنی اسی طرح اس کا مطالعہ بچشم خود ہی بلا شرکت غیرے کرتے

رہے۔ یہ خشک حقیقت اردو اہل قلم کے لئے کیسی ہی یاس انگیز دل شکن سہی۔ لیکن ذرا دیکھئے گا ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاشہ میں کس طرح جان ڈال کر اسے گویا کر دیا ہے ؎

کھلا دیوان مرا تو شور تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطلع کا بل آیا

شاعروں کا ضعف، لاغری و ناتوانی کا مضمون العظمت اللہ! ضرب المثل کی حد تک پہونچا ہوا ہے۔ جسے دیکھئے اپنی صحت سے نالاں، اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں۔ ہمارے حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی کہ کمزور اپنی صحت ہی کو نہیں اپنی بیماری کو باندھا اور اپنے نہ مرنے کو اپنی بیماری کی ہی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور میری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرت قوافی کے تو بادشاہ تھے۔ ایسے ایسے نادر قافیے ڈھونڈھ کر لاتے کہ ان کے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے۔ ہے کیسے کہ ان کے نمکدان ظرافت کی نمکینی کا ایک بڑا عنصر یہی نادر قافیہ بندی ہے۔ ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی دکھ درد کی کہانی سناتے ہیں لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو آبدیدہ کرنے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں ؎

ہر طرح راحت بھی مجھ کو دانت سے
قافیہ ان کا ملا تھا آنت سے

صحت اب بگڑی تو ان میں درد ہے
اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے

خواب راحت کس کو کھانا کون کھائے
رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے

درد کے آگے رہا منجن بھی گرد   مصطگی[1] بھی رہ گئی بار دو نے زرد

ایک دوسرا زعفران زار اس سے بھی بڑھ کر ملاحظہ ہو ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے   وہی مازو وہی کافور چلا جاتا ہے[2]

ڈاروِن[3] کے اس لکچر کا سبق ہے اب تک   وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے

برق کے طب سے آنکھوں کو بچائے اللہ   روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

"روشنی" اور "نور" کا یہ نازک فرق اس کے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا۔ اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ۔ نور علیٰ نور! قطعہ کا آخری شعر اپنے رنگ میں فرد ہے۔ ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا
آج تک شوق شقنقور[4] چلا جاتا ہے۔

اشعار ذیل میں جان محض قافیہ نے ڈال دی ہے ؎

جو سبھی بات ہے کہہ ڈالو گا بے خوف خطر انکو۔ نہیں رکنے کا میں ہرگز بری لوٹے کہ بن لوٹے
انار آتے جو کابل سے تو پڑتے سب کے حصے میں۔ امیر آئے تو کیا آئے مزے میں لارڈ منٹو[5] کے

---

[1] مصطگی رومی ایک مشہور دوا ہے۔ اور یونانی نسخوں میں اکثر منجنوں میں برتی رہتی ہے۔ زرد رنگ کی ہوتی ہے [2] مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوائیں ہیں [3] انگلستان کا مشہور سائنسداں اس کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع تک چلی گئی ہے یہاں تک کہ حیوانات کا ارتقا انسان پر ختم ہوا اور انسان اصلاً گوبا ترقی یافتہ بندروں کی، ہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔ [4] ماہی سقنقور یونانی طب میں مردانہ قوت کے لئے ایک مشہور دوا ہے۔ [5] لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے تھے غالباً ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک امیر حبیب اللہ خاں مرحوم والیٔ

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

"منٹو کے" کا قافیہ "جوم لوٹ کے" لانا بس اکبرؔ ہی کا حصہ تھا۔

ایک غزل اس زمین میں ہے "مجلس نو باقی ہے نرگس تو باقی ہے" اس کے مقطع میں ذانیہ "بیرس" کا لائے ہیں۔ اور وہ بھی کسی روانی اور بے تکلفی کے ساتھ

ہر مصرعہ قافیہ ہی کے لیے ہے خوب اے اکبرؔ
خواجہ لکھنؤ کچھ غم نہیں بیرس تو باقی ہے

اگرچہ اس میں واقعت بہر ظلم اچھا خاصا ہو گیا۔ لکھنؤ غریب انتہائی اوج و شباب کے زمانے میں بھی بھلا بیرس کے مقابلے میں کیا ٹھہر سکتا تھا

ظریفانہ کلام میں بارہا لفظ پست و مبتذل لاتے لیکن ایسا بامو قع برمحل اور بندش کچھ ایسی چست و نادر رکھتے کہ مصرعہ کا ٹھاٹھ ہی کچھ اور ہو جاتا۔ کلام میں پستی و ابتذال کی جگہ لطف و شگفتگی لے لیتی۔ اور مذاق سلیم خود پکار اٹھتا کہ بیشک "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست"۔

ایک شعر چند ہی صفحہ ادھر نقل ہو چکا ہے ؎

شانِ نماز اکبرؔ ناساز ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنے میاں وفاتی

اب "میاں وفاتی" چاہے عامیانہ ہو یا بازاری مگر اس موقع کے لئے چست اور موزوں کتنا ہے؟

اقبال کی مشہور نظم جواب شکوہ کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہو گا ؎

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱ سے آگے) افغانستان انھیں کے زمانے ہندوستان سیاحت کیلئے آئے تھے۔ شاہ افغانستان اس وقت امیر ہی کہلاتے تھے۔

جا کے مسجد میں جو ہوتے ہیں صف آرا تو غریب
زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارہ تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
امراء نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اکبر نے مضمون کے اس سارے دریا کو اپنے دو مصرعوں میں اور دو میں کیوں ایک ہی مصرعہ کے کوزہ میں بند کر دیا ہے ؎

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

"کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن" کیا خوب! زبانی فرماتے تھے کہ ایک بار دلی جانا ہوا۔ زمانہ کوئی سنہ ۱۳ و ۱۴ء کا ہوگا۔ برطانوی سرکار ہند کی راجدھانی کی منتقلی نئی نئی کلکتہ سے دلی ہوئی تھی۔ اور دلی بڑی تیزی سے نئی دلی بن رہا تھا۔ اجلاس امپیریل کونسل کے ہو رہے تھے اور مسلمان ہندوستان بھر کا جمع تھا۔ ایک دن نئی دہلی کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا نماز کے وقت دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پھٹے حالوں موذن صاحب تشریف لائے اور انھیں کے طبقہ کے دو ایک نمازی اور۔ بس کل اتنی ہی جماعت۔ نماز کے بعد موذن نے پوچھا کیوں بھائی سر ...... کبھی کبھی نماز پڑھنے آتے ہیں؟ اچھا وہ نہ سہی تو خان بہادر ...... صاحب؟ وہ بھی نہیں تو آنریبل نواب، تو ضرور ہی آتے ہوں گے۔ موذن غریب کو ان لیڈروں

کے اسم گرامی تک کی خبر نہ تھی۔ بیچارہ ہکا بکا میرا منھ دیکھا کیا اس پر میں نے کہا "تو اچھا تو یہ بات ہے" "کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن" اور بیشتر مصرعہ بلجد کو لگا دیا۔

ذکر غالباً ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الہ آباد میں حضرت اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانہ میں الہ آباد میں ہو رہا تھا۔ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبر مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک صاحب بول اٹھے کہ "کچھ بھی سہی بہر حال پھر شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشری حالت بہتر ہی ہے" لسان العصر بولے کہ جی کیا بات آپ نے پیدا کر دی ہے ہم ساری خدائی سے ذلیل سہی۔ پھر بھی یہ اطمینان کیا کچھ کم ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے۔ اور جب ہی تو میں نے کبھی عرض کیا ہے ؎

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں
کیا کم ہے یہ شرف کہ وفائی سے کم نہیں

"کیا کم ہے یہ شرف" اس ٹکڑے کو جی میں آتا ہے کہ بار بار پڑھے جائیے!

ایک جگہ "صاحب" کے مقابلہ میں صاحبیت زدہ گروہ کا جبر ان الفاظ میں اتارتے تھے ؎

لہ لعبد کو جس قانون ساز مجلس کا نام لیجسلیٹو اسمبلی پڑا اس وقت یہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کہلاتی تھی۔ اور اس کی ممبری ایک خاص عزت کی مالک سمجھی جاتی تھی۔

مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب
بدھو فلاسفی کے کمرہ میں سڑ رہے ہیں

کسی پچھلے کلیات میں مسلمانوں کے یاس انگیز مستقبل کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ چکے تھے ؎

حکم برٹش کا ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی حلو کا

پھر جب ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کے ایک مشہور و معروف عالم دین نے تحریک ترک موالات میں گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے پس رو ہونے کا اعلان کیا تو فوراً ارشاد ہوا ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر لفظ حرفوں سے مرکب نہیں بولتے پوری کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

"بدھو میاں" سے بڑھ کر ادر جامع اس موقع کے لئے اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟

کلیات اول میں مسلمان خاتون کی تعلیم کا عکس بھی ایسے ہی آئینہ میں دکھلا چکے ہیں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ترقی کی تپیس ہم پر چڑھا کیں — گھٹا کی دولت اسمجیں بڑھا کیں
رہیں پر پھر کے آیا بی نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

غرض پر کر کلو، صلو، بیبرو، حسو، بدھو، ننگو، گھورن، جمن دفاتی، شبراتی، کریمن، نصیبن وغیرہ کوئی لفظ بھی اکبر کی ٹکسال

سے باہر نہیں اور وہ ہر جگہ کام ان سے اپنی مرضی کا لینے رہتے ہیں۔ اور عنبر یہ تو پھر بھی علَم تھے۔ یعنی مردوں عورتوں کے ذاتی و شخصی نام۔ کمال یہ تھا کہ زبان کے عام لفظ مبتذل طبقہ سے اٹھا کر لاتے اور اپنے حسن و بندش کا و کمال مرصع سازی سے گرفت و بدزیب بدہیبت۔ سنگریزوں کو نگینہ بنا خاتم شعر میں جڑ دیتے ذاتی کی ایک غزل ہے ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اکبرؔ نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ "فالتو" بھی کیا خوب! اکبرؔ کے سوا یہ کس کے بس کی بات تھی کہ دیوزنت رو کو پری جمال بنا کر لا کھڑا کر دیتے! شاعر کے ذہن میں جو تحقیری تصور الہی عقل سے متعلق تھا۔ اسے کس خوبصورتی سے اس لفظ نے ادا کر دیا۔

کلیات دوم میں ایک قطعہ آزادی نسواں پر ہے — کوئی صاحب اپنے گھر میں بے پردگی کے خلاف وعظ شروع کرتے ہیں — لڑکیاں تردید پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اور سند میں "دولہا بھائی" کی رائے پیش کرتی ہیں ؎

دولہا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ
ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اس کے آگے یہی لڑکیاں خاندان کے مردوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں ؎

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو
ہم پہ تاکید ہے کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

"گٹ پٹ" اے سبحان اللہ! انگریزی کی ابجد نہیں، اے، بی، سی، ڈی نہیں۔ صرف گٹ پٹ — حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ مستقلاً نہ مبتذل ہے نہ خلاف متانت۔ اصل شئے اس کا موقع و محل استعمال ہے۔ اور اکبر اس موقع شناسی کے بادشاہ تھے۔

الفاظ سے گذر کر یہی سلوک مثلوں، محاوروں کے ساتھ کرتے رہے — بازار میں چلتے پھرتے کہیں ایک محاورہ ہتھیایا اور کہیں سے دوسرا۔ روزمرہ کے سانچہ میں ڈھال۔ سلاست و خوش بیانی کے قالب پر چڑھا۔ رنگ و روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح دے دیا کہ اب جس کی بھی نظر پڑی وہ لٹو ہو گیا۔ لڑکوں اور نابالغوں کا ذکر نہیں اچھے ثقہ بڑے بوڑھے انھیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنی میز پر یا ڈرائنگ روم کی کانسوں پر جگہ دینے لگے۔ فرش گلدان ان آرائشوں سے سجانے لگے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج
اب دم کی جگہ ملت نمدے کی جگہ کالج

"بات تر دم ہی نمدہ" یہ زبان شرفا کی نہیں عوام کی ہے لیکن اکبر کی کان نمک میں آکر ہر شے نمک بن جاتی ہے۔ اس لطف و لطافت

کے ساتھ انھوں نے اس کو کہا کہ بزرگان محفل کے چہروں پر شکن پڑنے کے بجائے اور مسکراہٹ آگئی۔

ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حرف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن تیزی سے منتقل ہوتا اور پھر بھی ان مناسبتوں کے بل پر دلچسپ و پر لطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بار خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
سر ہو گئے تو "بال" کا بھی شوق ہو گیا [1]

علاقہ پنجاب کے مقام کیمبل پور کے کوئی مذہبی اہل قلم منشی الف دین نامی تھے۔ ایک فتوی حقانیت اسلام پر لکھی اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لئے ارسال کی۔ پیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں جامع و مانع ریویو کر دیا۔ تصنیف و مصنف دونوں پر ؎

"الف دین" نے خوب لکھی کتاب
ملی جس سے "ب" دین کو راہ صواب

پہلے مصرعہ میں "الف" کے لام کو ساکن نہیں کسرہ کے ساتھ پڑھیے، دوسرے مصرعہ میں اس "الف" کے مقابلہ میں "ب" پڑھیے

---

[1] سر یعنی "نائٹ" انگریزی دور کا مشہور اور بہت اونچا خطاب۔ بال (BALL) انگریزی ناچ۔ اردو کے بال اور سر میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ بنگال کے ایک نامور شخص پی این سنہا تھے (جو آخر میں لارڈ سنہا ہو گئے تھے) جس زمانہ میں سر نائٹ کے خطاب سے سرفراز ہوئے ہیں اسی کے بعد یہ اطلاع بھی اخباروں میں آئی تھی کہ فلاں جگہ انگریزی رقص میں شریک ہوئے۔

سارا کھیل بس "الف" "ب" کا ہے۔

ذیل کا قطعہ کیا ہے ایک مستقل گد گدی ہے۔ بڑے سے بڑے خشک مزاج کے لئے بھی اور بات کچھ نہیں لفظی بھی نہیں، محض حرفی ہیر پھیر ہے

یہ کہتے تھے ایک لالہ باوقار | کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
رکی ہے انھیں سے ہماری نمود | یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا "حرام"، اور کہاں کا "حلال" | ہٹے ہائے حطی رہیں "رام لال"

"حرام" اور "حلال" سے ہائے حطی ہٹا کر دیکھ لیجئے نہ، وہی "رام" اور "لال" باقی رہ جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کرتے کہ کوئی عام و معمولی سا لفظ لے لیتے۔ اس کے حروف میں قطع و برید کر کے نئے نئے شگوفے معانی و مطالب کے پیدا کر دکھاتے۔ الفاظ وہی جو روز ہم آپ بولتے، سنتے رہتے ہیں۔ اکبر کی ذہانت بس ان کے اجزا ترکیبی ہیں، الٹ پھیر کر کر۔ نئے نئے قالب تیار کر دیتی۔ اور قوت خلاقی ان کاغذی پتلون میں نازک خیالی اور معنے طرازی کی روح پھونکتی جاتی۔ ایک آدھ مثال اس صنعت گری کی ابھی اوپر گذر چکی ہے۔ دو ایک مثالیں وہ بھی بے ساختہ دکھا دیئے۔ زبان قلم پر چلی آرہی ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۱۶ء میں جب روزنامہ "ہمدم" پہلے پہل نکلا ہے جالب مرحوم دہلوی کی ادارت میں اور اس اس نام کے موجودہ اخبار سے بالکل ہی مختلف تو اسی پر ارشاد ہوا ہے

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم ہے ہے | "دم" لکھنے پر بھی باقی "ہم" رہے

کیا بے تکلف سجع ہے!

الف۔ ب۔ ت۔ کے نام سے واقف تو جاہل تک ہیں۔ لیکن کسی بڑے عالم نے بھی محض ان ناموں سے تصوف و معرفت کا یہ درس کیوں حاصل کیا ہوگا ؎

الف، ب۔ ت، ہی کو پڑھ کریں سمجھا
الف اللہ کا، اور ماسوا بت

"ب" اور "ت" کو ملائیے تو بت بن جاتا ہے یا نہیں؟ بس تو اکبرؔ کا کہنا یہ ہے کہ الف تو اللہ کا ہوگیا اور اللہ کے سوا اب جو کچھ وہ بت ہی بت ہے یا۔ کیا نیا رنگ وحدت الوجود کو دے دیا!

"تعلیم" کا لفظ تو ہر شخص کی زبان پر ہے۔ علیؓ کا نام بھی عالم و عامی سب ہی جانتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے تو انہیں باب مدینۃ العلم بھی مانتے ہیں۔ اب اکبرؔ کی شاعری اور ساحری یہ ہے کہ ان دو بظاہر بالکل بے تعلق لفظوں کے درمیان رشتہ؟ اور کیسا گہرا رشتہ پیدا کر دیتے ہیں! ؎

سمجھاتی ہے مجھے نکتہ یہ میری طبع سلیم
علیؓ کی دم، ہیں جگہ ہو تو بس وہی تعلیم

ظاہری پہلو تو یہ ہوا کہ لفظ "علیؓ" کو اگر "ت" اور "م" کے حصار کے اندر لے لیا جائے۔ تو لفظ تعلیم بن جاتا ہے۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ حُبّ علیؓ کو قلب میں جگہ دینا حقیقی تعلیم ہے۔

سیاسیات کے دائرے میں خود بلاغت ان کے اس تراش و خراش کی بلائیں لیتی ہے سخن سنجی سر دھنتی ہے۔ معنی طرازی وجد میں آ رہتی۔ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

"ہ" سے ہند "م" سے مسلم یہ دونوں تھے ہم
سر پہ انگریزی "الف" اس سے ہوئی حالت "اہم"
ہے "الف" سے جدا لیکن محافظ اور معین
اس کے سایہ میں رہیں "ہ" "م" شامل ہوں "بہم"

لفظ "اہم" کی کتابت میں دیکھیے کہ حرف "الف" کیسا اکل کھرا الگ تھلگ، سر کشیدہ نظر آتا ہے بخلاف اس کے "ہ" اور "م" باہم شیر و شکر، ایک دوسرے سے مدغم! "ہ" اور "م" کے ادغام کی تصویر آج سنہ ۱۹۴۲ء میں، تو شاعرانہ معلوم ہو سکے گی۔ لیکن سنہ ۱۹ء و ۲۰ء میں جب یہ شعر کہا گیا ہے اس وقت یہ نقل تمامتر اصل تھی، باقی انگریزی "الف" کی اہمیت، اس کا اکل کھرا پن اور اس کا سر پر ہونا ضرور یہ کیفیتیں تو آج بھی جوں کی توں ہی ہیں۔

اسی گلشن کے ایک دوسرے چمن کی سیر سے

سر تراشا ان کا، کاٹا ان کا پاؤں — وہ ہوئے ٹھنڈے رگئے یہ بھی پگھل
شیخ کو یخ کر دیا، مومن کو موم — دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر (شین) تراش دیجئے، تو بیچارہ یخ ہو کر نہ رہے تو اور کیا کرے۔ مومن کا پیر "ن" کاٹ دیجئے تو بجز "موم" بن جانے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟۔ باقی کس نے شیخ اور مومن کو لولا بے سر و پا کر دیا۔ تو اب کیا ناظرین اتنی سخن فہمی سے بھی گئے گذرے ہوئے۔

اکبرؔ کے سنجیدہ کلام کا ذکر تو آگے آئے گا۔ لیکن ظریفانہ شاعری بھی اس پیر ظریف کی معنویت سے خالی نہ ہوتی۔ اوپر مثالیں بار ہا گذر چکیں کبھی کبھی اتفاقیہ دو چار شعر محض ہنسنے ہنسانے کے لئے بھی کہہ

دیتے۔ ورنہ عموماً صرف پردہ ظرافت کا تھا۔ باقی اصلاً مد نظر، کسی نہ کسی اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کی تعلیم ہی رہتی وہ بڑا فرق اپنے اور عام شاعروں کے درمیان پاتے۔ کبھی کہتے ؎

یوں اپنے آپ ہیں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں [۵۱]

یوں بھی کہا کرتے کہ شاعری سے مقصود تفریح و تفنن نہیں۔ یہ تو ایک آلہ ہے نفس کی تربیت اور اصلاح کا اور کہیں یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

ہے میری شاعری دل آگاہ کے لئے | تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے واہ کے لئے
جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لئے | ہے یہ دعا کہ ترک فضولی نصیب ہو
منہ کھل چکا تھا، ورنہ مرا آہ کے لئے | اک غل مچا کہ اس کو بھی لیسنس ہے ضرور

سنجیدہ بیانی کے باوجود آخری شعر میں ظرافت کے چٹخارے کے بغیر نہ رہ سکے۔

مشہور و پر عظمت شخصیتوں کی مخالفتیں بھی بڑے زور و شور کی ہوئی ہیں۔ اکبرؔ کی مخالفت اس درجہ میں تو نہ ہوئی۔ پھر بھی کبھی کبھی یار لوگ فن عروض و لغت کی کتابیں بغل میں دبا نکلتے ہی رہتے اور کلام اکبرؔ کی طرف انگلیاں اٹھا کر دبی زبان سے کہتے ہی رہتے کہ یہاں پر فن کی

---

[۵۱] حالیؔ کے بھی ایک قطعہ کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

حالیؔ کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے | پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالیؔ کا خطاب اپنے ہم عصروں سے ہے جن کے ترکش کا سب سے بڑا تیر یہ تھا کہ نہ دہلوی، نہ لکھنوی یہ پانی پتی بھلا شعر اور زبان کیا جانے۔

غلطی ہے۔ وہاں یہ لغزش ہے۔ اکبرؔ بحث و مباحثہ کے قریب بھی نہ جاتے نہ زبانی نہ تحریری، دوسروں کو نصیحت کیا کرتے کہ کبھی مدعی کے منہ نہ لگنا۔ اور کسی صاحب دعویٰ سے سوال و جواب میں نہ پڑنا۔ پھر بھی بشر تھے۔ منہ میں زبان رکھتے ہی تھے کبھی کبھی کچھ کہہ ہی اٹھتے جو بول ان کے منہ سے نکل جاتے۔ ظریفانہ ادب میں پتھر پر لکیر بن جاتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؂

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے

کہاں بلبل کی قدرتی، بے ساختہ ہم آہنگی، کہاں سارنگی کی مصنوعی روں روں! خیر یہ تقابل تو ہوتا ہے۔ باقی یہ سارنگی کے ضلع میں استاد بھی کیا خوب! ایک دوسری جگہ شوخی کا نمک ذرا تیز کر دیا ہے ؂

قاعدوں میں حسن معنی گم کرو
شعر میں کہتا ہوں مجھے تم کرو

اب چند شعر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے یونہی ملاحظہ کر لیجیے۔
باغ کی سیر آزادی و بے فکری سے خود بھی تو ایک چیز ہے۔ یہ کیا کہ پھولوں کے نام، نشان، رنگ و بو کی پوچھ پاچھ قدم قدم پر مالی سے ہوتی رہے ؂

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں عزیز	جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا
ہمیں بالشویک آ گیا یاد سن آئی ہے	یہاں تو فکر سرمائی ہے ماہ اور پیس آتا ہے [۱]

---

[۱] جس زمانہ کا یہ شعر ہے روس میں نیا نیا "بالشویک" انقلاب ہوا تھا۔ اور "بالشویک" حملہ کا دھڑکا ہر وقت ہندوستان پر لگا رہتا تھا۔

ابر شب ہے ہم اماں اے چرخ پائینگے کہاں[1] — آسماں بولا کہ ہم سے اڑکے جائیں گے کہاں

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ نند ہاں ہیں — لیکن معائنہ کو وہی نا بدان ہیں

ہجر کی شب یونہی کاٹ بھائیو — ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے — جو مارتے تھے مکھی اب ملتے ہیں چوہے

شاعر جو ملازم ہو اکبر ذہتوانیس ہے اس کا لقب — پوچھو گے یہ کیوں تو صحیح سنو تنخواہ بھی اور واہ بھی

جب عمر ہوا چڑھا یس دو بوتلیس اکٹھی — ملا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹی

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں — گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

ارتقاء کی برکت دیکھئے — تاجراب اہل قلم ہیں بالنسبہ کے

محاورات کو بدلیں" براہ ریل "جناب — ٹکٹ بدست "کہیں اب بجائے پابرکاب"

شیخ جی کے دو نوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پاگئے

یہ سب شعر زیادہ تر وہی شعر ہیں جو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ملیں گے۔ لیکن ظریفانہ کلام ایک اچھا بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس کے چھپنے کے وہ اپنی زندگی میں کسی طرح روادار نہ ہوئے۔ شاعر آخر شاعر، خدا جانے کیسے کیسے وہم انھیں گھیرے رہتے اور چھاپنا تو الگ رہا، ناجنسوں کو سناتے تک بھی نہیں تھے۔ بے تکلف دوست با نیاز مند کو اگر کہیں سنا بھی دیا تو سو تاکید یں کو خبردار اسے میری زندگی میں شائع نہ کر دینا۔ اس مخفی کلام کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے کہ حضرت اکبر کی زندگی میں بھی بے تکلف شائع کیا جا سکتا تھا۔ اور اب دنیائے فانی سے ان کے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد تو تھوڑا بہت مضائقہ

---

[1] ہوائی جہاز (Air ship)

بھی اس کی اشاعت میں باقی نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کلام بجز ان کے "صاحبزادہ" کے اور کسی کے پاس ہے ہی کہاں؟ اور صاحبزادہ صاحب اس خزانہ کے سانپ کی حیثیت رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ دو چار شعر۔ متفرق طور پر ادھر اُدھر سے سنے سنائے یاد رہ گئے وہ حاضر ہیں۔ ہائے اس وقت کیا خبر تھی کہ چند ہی روز میں یہ گوہر بے بہا ایسے نایاب ہو جائیں گے۔ اس وقت اس کا احساس ہوتا تو چرا چھپا کر، ضد کرکے، منا کر، غرض، رازی سے، زور سے، زر سے جس طرح بھی ممکن ہوتا، نقلیں ان منہ سے نکلے ہوئے الہامات کی ضرور ہی حاصل کرلی جاتیں!۔

اکبر بڑے گہرے مذہبی! لیکن تقشف و تنگ خیالی سے بالا تر، عابد، عالم، صوفی تھے، "زاہد خشک" نہ تھے، سید احمد خانی تحریکوں کو اپنی میٹھی چھری سے کچوکے ہی دیتے رہے۔ اور کلیات کے ہر حصہ میں تو کھل کھیلے ہیں۔ تاہم ذات سرسید احمد خاں کے مخالف نہ تھے اور ان پر فتاوی کفر کی بارش ہو گئی تھی! اس کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے، خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت و مغفرت ہر کلمہ گو کے لئے بے پایاں ہے۔ ہمارے مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ اسے اسقدر ضابطوں، قاعدوں میں جکڑ رکھا ہے وہاں نیت کا سوال سب پر مقدم ہے۔ مسلمان گنہ گار کے حق میں بالکل مولانا روم کے ہم مسلک و ہم زبان تھے ؎

ما دروں را بنگریم و حال را   ما بروں را ننگریم و قال را

ناظر قلبیم کو خاشع بود   گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

آخر زمانہ کی ایک غزل "دوا ہو نا نہ ہوئے"۔ "شفا ہو یا نہ ہوئے" کی زمین میں ہے۔ اسطرح کہتے ہیں ؎

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحبان کی تشبیہ پولیس والوں سے بڑی ہی پُر لطف ہے۔ ایک طرف ان کا احترام بھی۔ فرض شناسی کی داد بھی، دوسری طرف ان کی ضابطہ پرستی پر طعن بھی! خیر یہ شعر تو عمومی پہلو رکھتا ہے۔ ایک رباعی اپنے مخصوص رنگ میں سید احمد خانیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر کہی ہے۔ چوتھے مصرع میں شوخی ذرا اپنے حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ طریقہ اکبر کا نہ تھا۔ یہ بزرگ کے نام کا بڑا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پہلے اور تیسرے مصرعہ کے الفاظ پوری طرح حافظہ میں نہیں ممکن ہے کہ فرق ہو گیا ہے ؎

کتا جیسے لپکر جیفہ دوڑے   یوں دہریہ نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے جنت حضرت   لٹھ لے کے امام ابوحنیفہ دوڑے ۱؎

آخر ۱۹۱۸ء تھا جبکہ لکھنؤ میں رباعی اس زندہ دل زندہ جاوید شاعر نے اپنی زبان مبارک سے ہنستے ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ ہنساتے ہوئے سنائی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ "دیکھئے میری زندگی میں کہیں چھاپ نہ دیجئے گا۔ ورنہ مولوی صاحبان جان غضب میں کر دیں گے میں تو جنت کا خیالی سماں دکھایا ہے۔ یہ لوگ اسی دنیا میں میرے اوپر لٹھ لیکے دوڑ پڑیں گے"

سنہ ۱۹۱۹ء میں جب ٹرکی سے (بہ سلسلہ جرمنی) برطانیہ کی جنگ ہو چکی تھی اور برطانوی مدبرین قسطنطنیہ سے ترکوں کا اخراج کا منصوبہ باندھ چکے تھے۔ اس وقت اسی قافیہ کے ساتھ پھر ایک رباعی ارشاد ہوئی فرمانا یہ تھا کہ اسلام کا مذہبی اثر تو مدت ہوئی قلوب سے مٹ چکا ہے اب

نہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں عبادت کے چرچے ہیں اور نہ درسگاہوں میں کہیں دینی تعلیم کا رواج ہے۔ لے دے کے دنیوی اقتدار کی یادگار ایک ترکی سلطنت باقی تھی۔ یہ جھلملاتی شمع بھی زمانہ کی تیز آندھی کے جھکڑوں سے گل ہو کر رہی۔ مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ قیامت کا اثر رکھتا ہے۔ مجازاً بھی حقیقتاً بھی، مجازاً تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مصیبت مسلمانان عالم کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا شیرازۂ ملی ہی منتشر ہو گیا۔ اور حقیقتاً اس لحاظ سے کہ حدیث نبوی کی پیشین گوئی کے مطابق قسطنطنیہ سے اسلامی حکومت کا اٹھ جانا قرب قیامت کی علامت ہے۔ اب دیکھئے اس سارے مضمون کو کیا کوزہ میں بند کیا ہے ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت کالج سے امام ابوحنیفہ رخصت
"صاحب" سے سنی ہے اب "قیامت" کی خبر قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

مرثیہ کے مضمون کو لطیفہ کی صورت میں پیش کرنا اکبرؔ کا حصہ تھا۔ اللہ اکبر!

سر جیمس مسٹن (لفٹنٹ گورنر یوپی) کی حکومت علی گڈھ سے ناخوش ہوئی۔ کچھ ادھر کا اشارہ پا اور کچھ دوسرے اسباب سے بھی علی گڈھ کا زور اور مرکزیت توڑنے کے لئے اودھ کے شیعہ رئیسوں نے لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج کی طرح ڈال دی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تعلیم کے متوالے "روشن خیالوں" کو بھلا "کالج" سے کیوں اختلاف ہونے لگا۔ انھیں منہ مانگی مراد ملی۔ لیکن شیعوں میں بھی جو ذرا دور اندیش تھے وہ تاڑ گئے کہ یہ تو صریح ضرب ہے علی گڈھ کی مرکزیت پر۔ عین اسی زمانہ میں حضرت اکبرؔ کا آنا لکھنؤ ہوا۔ مشہور شیعہ رئیس راجہ صاحب محمود آباد کے ایک شیعہ

لے (حاشیہ صفحہ ۱۸۱ پر ملاحظہ ہو)

صاحب ملنے آئے۔ چرچے تو ہر جگہ ہو رہے تھے۔ یہاں بھی بات اسی کالج کی چھڑی
وہ صاحب بولے۔ "ہمارے سرکار اسی لئے تو کالج سے بالکل الگ تھلگ ہیں
خواہ شیعہ سنی کے درمیان ایک اختلاف کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ اکبر ابھی
سنیت میں بڑے سخت لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی کالجوں کے حقیقت
شناس کچھ اس سے بھی زائد تھے۔ بولے "جی نہیں علی گڑھ والوں کو کیوں
برا لگے گا وہ تو اور خوش ہوں گے کہ چلئے ہماری تحریک کو کامیابی ہوئی
اور ہماری ہی ایک شاخ اور کھل کر رہی۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا　　　کالج ہے یہ کچھ امام باڑا تو نہیں

یہ بھی کیا کوئی مذہبی چیز ہے؟ مسجد ہے؟ امام باڑہ ہے؟ علی گڑھ والے اس
سے کیوں چڑھنے لگے وہ تو اور خوش ہوں گے کہ چلئے ہمارے ہی مشن کی اعانت ہوئی۔
کیا نگاہ تھی۔ قومی۔ ملی مجلسی زندگی کے ہر بڑے چھوٹے ایک ایک جزئیہ
پر نظر رکھتے نظر بھی کیسی عقابی، ہمہ گیر نظر۔ لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ
الّا احصاھا[۵] کا نمونہ مجال کیا کہ ادھر واقعہ، غیر معمولی نہیں، معمولی سا بھی ہو
اور ادھر وہ پیر ظریف کے رجسٹر میں درج نہ ہو جائے!۔ اور پھر جو تصویر

---

[۴] بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷ کا [۴] راجہ محمد علی محمد خاں والی محمود آباد (بعد کو سر مہاراجہ محمود آباد) اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی ملی زندگی میں ایک بڑا امتیازی مرتبہ رکھتے تھے اور برسہا برس ان کا شمار مسلمانوں کے بڑے لیڈروں میں ہوتا رہا۔

[۵] ۔ سورہ کہف کی آیت۔ ذکر نامہ اعمال کا ہے۔ کہ قیامت میں اسے دیکھ، کافر چلّا اٹھے گا کہ "ہائے میری کمبختی یہ کیسا رجسٹر ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں۔

تیار کرتے اس میں کیسے کیسے بظاہر بے جوڑ واقعات میں جوڑ اور بے ربط
حالات کے درمیان ربط پیدا کر دیتے تھے دلکشی اور دلآویزی تو حصہ تھی
ان کے تخیل کا۔

• ذکر شروع ۱۹۱۷ء کا ہے۔ علی گڈھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
اس وقت مسلمانوں کی بڑی چہیتی اور سب سے بڑی مرکزی انجمن تھی
اس کے کار فرما صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر اخبارات میں لے دے
زور و شور ہو رہی تھی کہ اتنے میں وہ وزیر ہند کی انڈیا کونسل کے ممبر
ہو کر لندن تشریف لے گئے۔ ان کے جاتے ہی طوفان مخالفت دھیما پڑ
گیا۔ ایک واقعہ یہ اپنی جگہ پر تھا۔ دوسرا واقعہ ٹھیک اسی زمانہ میں پیش آیا
کہ لکھنؤ میں ایک صاحب تھے مولوی نظام الدین حسن نیوتنوی ..... ایک
اعلیٰ پنشنر عہدیدار اور ریاضیات و ہیئت کے ماہر۔ انھیں رویت
ہلال کے مسئلہ پر مضمون نگاری کی سوجھی۔ لکھنؤ کے مقبول و مشہور
روزنامہ "ہمدم" میں (سید جالب والے ہمدم میں) لکھ دیا کہ علم ہیئت
کا حساب بالکل کافی اور قابل اعتماد ہے۔ ہلال کی شہادت عینی سے بے
نیاز کر دینے والا علماء شریعت اس بدعت پر کیسے سکوت اختیار
کر سکتے تھے۔ فرنگی محل لکھنؤ سے جواب پر جواب نکلنے شروع ہوئے۔
اچھا خاصا اکھاڑہ قائم ہو گیا۔ قلمی اور اخباری۔ اکبرؔ کی ذہانت کب
چوک جانے والی تھی۔ دونوں بے تعلق بے ربط واقعات کو ایک
رشتہ میں پرو کر موتیوں کی لڑی تیار کر دی۔ پوری نظم تو اب یاد نہیں
ہے۔ قطعہ کی جان آخری مصرعہ تھا ؎

آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

کیا کہنا ہے ہماری قوم کی زندگی کا! کوئی نہ کوئی پھلجھڑی ہر روز اس کو چاہیے۔ کل تک قوم کے آفتاب پر گرم گرم نگاہیں پڑتی رہیں۔ ان بچارہ کی گلو خلاصی ہوئی تو لیجیے مسئلہ رویت ہلال پر چاند ماری شروع ہو گئی!

سنہ ۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کا یورپ جانا طے ہوا۔ صدر وفد رئیس ملت مولانا محمد علی تھے۔ ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی (مدیر رسالہ معارف) بھی قرار پائے۔ اکبرؔ کو یہ بات کھل گئی کہ ایک عالم دین سیاسیات کا ضمیمہ بنے ہوئے ولایت جا رہے ہیں شاعری کی سادگی اور الفاظ کی نظر بندی ملاحظہ ہو کہ پیشانی کی چڑھی ہوئی تیوریوں کو خندہ جبینی اور مسکراہٹ کے نقاب میں لپیٹے یوں گویا ہوئے

سلیمان کی بات کیسی بنی	کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے	مگر جلائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں	خدا غیر سے ان کو کر دے غنی

اپنے دل کو شبہ کیا معنی یقین ہے کہ یہ نظم بس اتنی ہی نہ ہوگی کچھ اور بھی ضرور فرمایا ہوگا۔ لیکن اپنی زبان مبارک سے سنایا اسی قدر تھا [۱]

گو بہت کم لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ شوخ نگاری کی

---

[۱] بادہ نوشی کے سلسلہ میں "کھنچنا" اور جلائے کے ضلع میں "گاڑھی چھننا" خوب ہی نہیں بہت خوب۔ انھیں مولانا سید سلیمان ندوی کے متعلق اسی سلسلہ وفد یورپ میں یہ شعر بھی ارشاد ہوا ہے ؎

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پر	مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر

باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیتے اور ظرافت کے حمام میں تخلی بالطبع ہو کر داخل ہوتے اس وقت متانت اپنا منہ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں ایک ہلکا سا نمونہ اس صفت کا بھی ملاحظہ ہو۔ یورپ میں جنگ عظیم برپا ہے۔ ترکی غریب پر ہر طرف سے یلغار رہے۔ بتیس ۳۲ دانتوں میں ایک زبان اور روزانہ دردناک خبریں آرہی ہیں کہ آج یہ مقام گیا کل وہ۔ یہاں تک کہ حریف کا قدم سالونکا پہونچ گیا (اس مقام کا نام یاد رہے) سارا عالم اسلامی غم و اضطراب میں مبتلا۔ مرکز خلافت کی مظلومیت و بےکسی پر دنیائے اسلام کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بنا ہوا۔ عین اس وقت حضرت اکبرؔ اپنے بند کمرہ میں یہ چار مصرعے بےتکلف دوستوں کو سناتے ہیں۔ منٹ دو منٹ کے لئے اداسی، بشاشت میں بدل جاتی ہے۔ اور آہیں بھرنے والے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں	ملحوظ رکھے دنیا اس رشتہ و رحم کو
پھر کر کے اس پہ قبضہ کہہ دیں یہ ترکوں سے	"سالونکا" سا ہے تو "سالونکا" لو ہم کو

نظم شدہ شدہ دلی کے ایک ہفتہ وار کو لگ گئی۔ اور اس نے اپنے یہاں چھاپ بھی دی۔ حضرت اکبرؔ کو خبر ہوئی بہت ہی جز بز ہوئے کہ ان اخبار والوں تک کون ایسی باتیں پہونچا دیتا ہے۔ اس خاکسار نے عرض کیا "مگر نظم میں کوئی بات ایسی ویسی تو ہے نہیں۔ جس لفظ کو کریہہ خیال فرمایا گیا ہے۔ اس میں آپ نے کراہت اور اس کی دشنامی حیثیت باقی ہی کب رہنے دی ہے؟۔ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں آپ نے خود ہی رشتہ کا اعلان کر کے دنیا کو خوب جتادیا ہے اور آپ لے

مستقل رشتہ کی حیثیت سے لائے ہیں۔ گالی اب وہ رہی کہاں؟ اس گزارش سے حضرت مطمئن تو نہ ہوئے لیکن محظوظ ضرور ہوئے۔

(ب)

سیاسیات

سیاسیات سے براہ راست حضرت اکبرؔ کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ ان کا یہ فن نہ اس موضوع سے انھیں کوئی خاص مناسبت، لیکن تھے پورے مشرقی اور مشرقی سے بھی بڑھ کر مذہبی۔ یہ دل و دماغ نہایت درجہ حساس، اس لئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات ان کے دل میں چبھ جاتی،

اور مجبوراً خارزار سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کرکے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا اور ملازمت کا آخری زمانہ تو خاصے علی عہدوں پر۔ اس کے بعد پنشن کے طوق سے گراں بار اور خطاب خاں بہادری کی زنجیر طلائی سے پابجولاں رہے۔ اس لئے زبان پر آخر تک مصلحت اندیشیوں کی مہر لگی رہی۔ اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی کھلے الفاظ میں نہ کر سکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے۔ اور اوپر شکر کا غلاف اسقدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولیاں اتارتا، اور ادھر زبان سے کہ فرط حلاوت سے ہونٹ چاٹتی رہتی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و ترک موالات دونوں کا جوش اپنے شباب پر تھا۔ وفات سے چند ماہ بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے لکھ ڈالا اس میں خلافت و ترک موالات کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مختلف خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی پر لطف نظم نہ مرحوم کے زمانہ میں شائع ہوئی نہ اب اس کے بعد بھی [1]۔ لیکن جب شاعر اور خود تحریکات کو ختم ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا ہے اور اب اس نظم میں ظاہر ہے کہ کوئی زندہ لطف باقی نہیں رہ سکتا۔ زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے جب تک متعلقہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں۔ ہاں تاریخی لطف البتہ بعد کو بھی قائم رہ سکتا ہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل جب آخر بار الہ آباد میں حاضر خدمت ہوا

---

[1] بالآخر گاندھی نامہ گو بہت غلط سلط ۱۹۴۹ء میں ہوا۔

ہوں، چند شعر زبان مبارک سے سننے میں آتے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں۔ نقل لینے کی اجازت اس وقت کیا ملتی خود اپنی بھی ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی۔

کلیات سوم میں سیاسی اشارے کنائے، رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں سینکڑوں جگہ ملیں گی۔ کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے۔ بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جب نظر بندوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام سب نظر بند ہو چکے تھے : ذیل کی بلیغ و پُر معنی غزل ارشاد ہوئی ؎

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند — مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
ہماری بیکسی کب تک چھپے گی — خدا پر تو نہیں راہ خبر بند
بہ یاد رنج یاراں نظر بند — کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں درد ہی کی کچھ کمی ہے — نہیں ہے آہ پر راہ اثر بند
بُت مشرق نہیں محتاج ساماں — کمر ہی جب نہیں، کیسا کمر بند
کھونگا مرثیہ اس غم میں ایسا — کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیال چشم فتاں میں ہوا محو — مرا دل اب ہے سینہ میں نظر بند

لیکن اظہار خیال کی یہ صورت حال۔ عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح و ترقی کی کوئی خاص اصل بیان کرتے ہیں۔ یا اسباب تنزل میں کسی متعین سبب کی جانب رہنمائی کرتے ہیں یا موجودہ صورت حال سے مستقبل کا استنباط کرتے ہیں۔ اور یا پھر حریف کے کسی زبردست وار کو رد کرتے ہیں۔ تحریری سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گذار ہے، سب کو معلوم

ہے۔ بڑے بڑے محتاط مسافروں کی اور بڑے بڑے ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ تو اپنے تئیں زخموں سے چور اور جراحتوں سے فگار ہی پایا ہے۔ لیکن اس پیمبر سخن کا اعجاز یہ تھا کہ اس کے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا۔ سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہو گئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزور شمشیر کی۔ ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ہماری شمشیر کی یہ دھوم دھام ہے۔ لیکن آپ نے اپنی توپ کے کارناموں پر بھی کبھی نظر کی ہے۔ ہم نے بالغرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی۔ توحید و رسالت ہی کی۔ گردنیں اسلئے ماریں کہ دوزخ کے عذاب سے بچائیں۔ جنت کی دائمی راحت کی راہ دکھائیں مئے فروشی، سود بازی، بے حجابی، حرامکاری، زر پرستی، فواحش کی اشاعت کے لئے تو نہیں کی۔ توپ دم سارے کے سارے قبیلوں کو اس لئے تو نہیں کر دیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، ان کی جائدادوں پر، ان کی دولت پر کریں اور ان کی جانوں کو، اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں۔ لمبے چوڑے مضمون کو دو شعروں میں یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پرواہ ہے غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے کہ تیغ سے پھیلا اسلام یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور ناتواں قوموں کی قوت مقاومت توڑنے اور ان کے جسموں کو ہلاک کرنے کے لئے تو توپ، گولہ، بندوق، مشین گن استعمال ہوتی ہیں پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما انھیں بد بختوں کے دلوں، دماغوں اور

روحوں کو غلامی کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیم گاہیں کھول دی جاتی ہیں۔ غرض کمزور اقوام کے مقابلے "صاحب" کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی ان کے جسموں اور روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ اس خشک حقیقت کو کس نرز بانی سے بیان کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی، پروفیسر پہونچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری صلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لے لے کر جس قدر بھی کارگذاریاں، ہمارے "یہ خداوند" کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے لئے درس گاہیں کھولتے ہیں۔ عدالتیں قائم کرتے ہیں، معیشت میں سہولت بہم پہونچاتے ہیں۔ ان سب کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں۔

اس اونٹ کو خرعیسی بنا کے چھوڑینگے ۔۔۔ وہ اس کو محو کلیسا بنا کے چھوڑینگے
شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑینگے ۔۔۔ کریں گے شوق سے مسلم غذائیں مئے داخل
کہ تجھ کو بھی وہ کبھی سا بنا کے چھوڑینگے ۔۔۔ کہا یہ شیخ نے اکبرؔ سے روک اپنی زباں

"اونٹ" اور "خرعیسیٰ" اکبرؔ کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں۔ "مسلمان" اور "صاحب" کے لئے "اونٹ" اور "گائے" کا بھی ذکر کثرت سے آیا ہے۔ مسلمان اور ہندو کے لئے "خرعیسی" کا کام کہیں کہیں "جان بل" سے بھی لیا ہے اور کہیں "بندر" سے۔

اکبرؔ کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصول قوت تھا اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا

طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں۔ سیاسیات نام ہے توازن قوت کا۔ جو قوم جس قدر قوی ہوگی اسی قدر دوسروں کے مقابلے میں ممتاز ہوگی طاقت ور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی۔ اور کمزور کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑے گا۔ تحصیل قوت کی بار بار تعلیم دیتے ہیں مثلاً سلہ

مذہب سوسائٹی ہے اور دین آخرت ہے
پولٹیکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت ہے[1]

صحیح طریقہ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے نہ یہ کہ شکوہ و شکایات یا خوشامد و تملق میں وقت ضائع کیا جائے ۔

نہایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مردہ
مناسب داد دینا ہے مجھے یارب کہ رونا ہے
مدارائی مناسب ہے کہ جینا اپنا ثابت کرو
خوشامد یا شکایت دونوں ہی میں وقت کھوتا ہے

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بننا لاحاصل ہے۔ یہاں ہاتھ بن کر رہنا چاہئے۔ ۔

زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ
ہاتھ بھی دے خدا زبان بھی دے

ترک ہوں خواہ عرب، اسلام کے اقتدار دینوی کے محافظ وہی ہو سکتے ہیں۔ جن کی تلوار میں دم موجود ہے[2]

---

[1] مصرعہ میں "پولٹیکل" پالٹکس کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔

[2] ترک اس وقت تک محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے اور عرب کے حاکم تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸ پر)

کوئی عرب کے ساتھ ہو کوئی عجم کے ساتھ
کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب علم کے ساتھ

زور بازو ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل۔ اور وہ بھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں۔ تاہم کم از کم اس محدود دائرہ کے اندر تو وہ اپنی قوت کو بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں ؎

گو رہتے ہیں ممبری کا فانی بر شاد — لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر شاد[۱]

جب تک قوت ہاتھ میں نہیں زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محفل طرازی سب بیکار ہے۔ پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہئے۔ مگر کیا اتنے سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی؟ ؎

روز ولیش کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں مگر کھانا نہیں آتا

اس وقت صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جو تذبذب کشمکش، دو دلی میں مبتلا ہیں۔ باقی قومیں یا تو حکمراں قوت میں جذب ہو گئیں۔ یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہے۔ اس حقیقت کو کس اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

(سلسلۂ حاشیہ صفحہ ۵۵) "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا۔ عربوں میں نیا جوش اس وقت پیدا کیا گیا تھا کہ اپنے کو ترکوں کی محکومی سے آزاد کرائیں ——— سنہ ۱۹۲۲ء میں یہ تلمیحات معمولی تھیں۔ ہر پڑھے لکھے کی سمجھ میں از خود آجاتی تھیں۔

[۱] یاد کر لیجئے کہ کلام سنہ ۱۹۱۹ء سے قبل کا ہے اور مقالہ کا سال تحریر سنہ ۱۹۲۲ء ہے

سجانی صاحب تو ادھر فکر سادات میں ہیں
شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں[1]

قوم کے حق میں تو انجمن کے سوا کچھ بھی نہیں
صرف آنر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں

سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف
اک ہمیں اس رزولیوشن کی خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خود ضعیفی و کمزوری کی دلیل ہے۔ اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی خودداری پہلے ہی سے ضعیف ہو چلی ہے ؎

کونسل میں سوال کرنے لگے
تو طاقت نے جواب دیا

اس سوال و جواب کا پورا لطف جب ہے۔ یہ یاد رہے کہ "سوال کرنا" اردو محاوروں میں کن کن موقعوں پر آتا ہے اور پھر "جواب دینا" بھی کن کن معنوں میں۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ترقی سمجھ رہے ہیں یہ سب ہماری نہیں انھیں کے ترقی ہے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی

---

[1] حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کئے تھے اور فوراً ایک گرامی نامہ بھی تحریر فرماتے تھے۔ شیخ صاحب سے اشارہ قریب مولانا آزاد سجانی کی جانب ہے جو اس وقت مدرسے الالٰہیات کانپور کے شیخ تھے اور ہنگامہ مسجد کے سلسلہ میں گرفتار ہو چکے تھے۔

یونیورسٹی بنالی۔ وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک بڑا سا چہ اور تیار ہو گیا۔ ہم تو بیاں اچھال رہے ہیں کہ اب تو گورنری تک ہمیں ملنے لگی ہے۔ چیار اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ نادان جیڑیا کس بھولے پن سے اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہو گئی۔ بس اتنا ہی ہوا کہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی کر دینی پڑی ہیں۔ اس صورت حال کی تصویر کتنی موثر اور سچی اکبر کے مرقع میں ملے گی ۔

اھنیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے، انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضمون، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات انکی

بت کدہ جب ہماری عزت کیا خاک ہو سکتی ہے۔ جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو تشقہ ہماری پیشانی پر ہے۔ وہ بھی ہمارا اپنا نہیں غیر دل کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ ہماری بیدست دپائی کا نشان اور کلنگ کا ٹیکہ ـــــ وفاداری کی مسلمہ پالیسی جو ملت پر کہنا چاہئے کہ کوئی چالیس سال تک مسلط رہی، یہ تمام اسی کی تفسیر و تفصیل بیان ہو رہی ہے ۔

عزت اکبر نہ مثل برہمن در دیر بود
تشقہ بود ش بر جبیں لیکن ز دست غیر بود

اپنی بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہ سنیے۔ نئی اور پھڑکتی ہوئی نہیں۔ بلکہ کُردتی اور اچکتی ہوئی اسے کمند ڈال کر گرفت میں لانا اکبر ہی کی ظرافت کا رذہانت کا حصہ تھا ۔

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

گوری قوموں کو تو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں جس خطہ میں جس جتن سے بھی چاہیں قابض ہو جائیں۔ حکومت قائم کر لیں۔ ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی کہ حکمرانی و جہاں نباتی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے لیکن اگر کوئی مشرقی قوم خصوصاً مسلمان کہیں بھی سنبھلنا چاہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے لگیں تو انھیں روکئے، تھامئے، ماریئے، پیٹئے، نوچئے، کھاڑیئے۔ بلگیریا، سراویا، رومانیہ یونان اگر بڑھیں[1]۔ ترقی کریں تو یہ ان کا حق ہی ہے۔ انھیں خوب بڑھاوے ملتے رہیں۔ لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی محض اپنی کمر ہی کسنا چاہیے، تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھے کہ لو وہ "پین اسلامزم" کا جن باہر نکل آیا۔ اب مہذب و شائستہ مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں۔ حالات و واقعات کی اس رفتار سے واقف تو اب بچہ بچہ ہو چکا ہے لسان العصر بھی اس حقیقت کو اپنی زبان میں دہراتے چلتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں ظرافت کے کھلونے لئے ہوئے ہیں۔ انھیں زور زور سے اچھالتے جاتے ہیں۔ اور زیر لب مرثیہ بھی پڑھتے چلتے ہیں نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں، اور زیر لب آواز ہے کہ کسی کے کان میں آتی ہے اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سرفرازی ہو تو "اونٹوں" کی تو گردن کاٹئے
اگر "بندر" کی بن آئے توفیض ارتقا کہئے

کہا جاتا ہے کہلایا جاتا ہے کہ عہد حاضر کی برکتیں دیکھو، خدا

[1] مقالہ کا سال تحریر

کی رحمتوں کی طرح شمار و حساب سے باہر ہیں۔ اسکول ہیں۔ کالج ہیں، ریل ہے۔ تار ہے، اسپتال ہیں وغیرہ۔ عندلیب گلشن حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری "برکتیں"، برکتیں مان بھی لی جائیں۔ جب بھی بلبل تو دلدادہ اپنی آزادی پرواز کا ہے۔ صیاد کا سجا سجایا رنگین و پرتکلف قفس اس کے کس کام کا؟ ؎

کہا صیاد نے بلبل سے کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی
نشاط طبع کی مہلک، مگر بیکاری پر ہے

مسلمانوں کے لئے یہی قہر الہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی کھو چکا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے: آپ مل گئے، اونٹ راستہ تو بھول ہی چکا تھا۔ لیکن شاید بھٹکتے بھٹکتے منزل مقصود تک کبھی پہونچ ہی جاتا ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ زمین پر لٹکتی ہوئی نکیل بندے بازار کے ہاتھ آگئی۔ اور اچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ زبانی خاطر داریوں کی لفظی واہ واہ میں اب بھی کمی نہیں۔ لیکن یہ مجال کس کی کہ جو مساوات کا کلمۂ کفر زبان پر لا سکے ؎

گم کی تھی میں نے راہ مصیبت یہی تھی سخت
اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے
باتیں بھی مجھ سے کہیں، مری خاطر بھی کی بہت
لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے
کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت

دو چار برگ خشک تو دو چار بر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشۂ چشم بھی ہمارے لئے طرۂ افتخار۔ "صاحب" کا ادنیٰ التفات بھی ہمارے لئے موجب ناز۔ فرنگیت سے شرمانا کیسا۔ وہ تو ایسی ہمارے خون میں رچ گئی ہے، روح میں بس گئی ہے ؎

ان کو لبکٹ کے لئے سوچ کی تھیلی مل گئی
کیمپ میں غل مچ گیا، مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

بیمار ہم پڑیں تو علاج سرکاری شفا خانوں میں کرائیں۔ بچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کرایا ہوا پڑھیں۔ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں۔ مدد سرکاری پولیس کی لائیں۔ جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و امتیاز سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ غرض سرکار کی دولت مدار کا دامن عاطفت آغوش مادر سے بھی بڑھ کر وسیع ہو گیا ہے۔ اور ہمیں ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے ہماری خودی سے دور کرتا جا رہا ہے۔ آخر اس صورت حال کا اثر ملت کی سیرت پر کیا پڑے گا۔ اور کیا پڑ رہا ہے۔ یہ سوال اکثر زبانوں پر ہے۔ جواب کے لئے اکبر مرحوم کے جام جہاں نما میں دیکھیں ؎

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج
بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید

ہر گام پر جو طاعت حق سے الگ پڑا | ہوتے رہو گے مرکز قومی سے تم بعید
ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب | ہو جاؤ گے بنانِ کلیسا کے تم مرید
شاید یہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی | ہر چند ابھی ہے درس کے پردہ میں تا پدید

حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا — حافظ کا ایک شعر جو معنی کو تھا مفید

سرِ ازل کہ عارفِ سالک بکس نہ گفت

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستارانِ وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے۔ اور ظاہری خاطر داری کے عقب میں خلوص کی مقدار کتنی رہی ہے۔ اس کی توضیح و تشریح سے خشک نثر میں اخبارات کے کالم روز ہی بھرے رہتے ہیں۔ اکبرؔ، قادر الکلامی نے اس سارے دفتر کو ایک مصرع میں سمیٹ لیا۔ "دریا کو کوزہ میں بند کرنا" یہ مثل تو آپ نے بارہا سنی ہوگی۔ صحیح مثال و نظیر اس کی یہیں ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظِ طریقت — دنیا کے دولت والوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق

اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو — انگریز کو ہے "نیٹو"[1] سے جس قدر تعلق

بڑے بڑے پُرجوش اخباری ادارئے، بڑی بڑی شعلہ بار سیاسی تقریریں، ان چار مصرعوں کی بلاغت، جامعیت نکتہ وری پر قربان ہیں!

بیرونیوں اور بدیسیوں کی کفش برادریوں سے تو اپنوں کی غلامی۔ چاہے اپنے کوئی بھی ہوں ہر حال و صورت بہتر[2] ہے۔ اس خیال کو ذرا دیکھیے کس مزہ داری سے ادا کیا ہے ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک ہاتی — بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

۱؎ (Native) دیسی آدمی۔ یا گوراشاہی زبان میں "کالا آدمی"۔

۲؎ ۱۹۵۱ء میں نظرثانی کے وقت ان فقروں کو پڑھ کر عجیب حسرت طاری ہوتی ہے ہندی مسلمان اس دورِ آزادی سے کہیں زیادہ تو اس دورِ غلامی ہی میں تھا۔

دیس کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں۔ باقی دیس ایک راگنی کا بھی نام ہے۔ گانا، دھن، دیس اب سب اکٹھے ہو گئے۔ لبکٹ کا اشارہ "صاحب" کی میز کی طرف۔ "پوری" کا ہندو کی رسوئی کی طرف۔ "چپاتی" کا مسلمان کے باورچی خانے کی طرف سے بالکل کھلا ہوا ہے۔

ہندیوں کی باہمی ناچاقی ضرب المثل کی حد تک پہونچی ہوئی ہے "صاحب" بھی اس رمز سے خوب آگاہ ہیں۔ جب کبھی اس آگ کو سرد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کبھی بندش ذبح گاؤ کا اشغلہ چھوڑ دیا۔ کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قضیہ لے بیٹھے۔ کبھی مسجد کے آگے باجے کا سوال چھیڑ دیا اور کبھی بڑا ہوا حملہ افغانستان کا بنا کر پیش کر دیا۔ اکبرؔ کی نگاہ دوررس نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے۔ زبان کے معاملے میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کے لئے تیار نہ ہوگا اتحاد وطنی کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی سادہ مزاجی، کم فہمی، نادانی پر تاسف و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

کہنا ہے مجھکو جو کچھ سنئے گا اس صدی میں	پوچھا کہ اس صدی میں کیوں جیپ رہ گئے جی ہیں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیان میں	کہنا ہے جو کہیں ہم وہ کون سی زبان میں
سن کر یہ بات ان سے ہر اک کو آیا چکر	اک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہکر
پیر فلک نہ کیونکر ابواب بحث کھولے	جیتے رہیں گرو جی، زندہ رہیں یہ بھولے

غیر ملکی حکومت کی یہ بدگمانی اور سخت گیریاں خدا کی پناہ بات بات پر گرفت۔ خود غرضیہ و عاشقانہ شعروں کے اندر بھی غدر بغاوت و قانون شکنی کے جراثیم سرکاری خوردبین میں عیاں۔ اس داروگیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر شاعر کے نگارخانہ میں ملاحظہ ہو ؎

ایک غزل میں اتفاقاً میرا اک مصرعہ یہ تھا دیدۂ عبرت سے رنگ دہر فانی دیکھئے
کوئی بول اٹھا زوال حسن بت مقصود ہے اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے
عارفانہ شاعری بھی آجکل دشوار ہے بزم دنیا میں یہ روز بدگمانی دیکھئے

اکبرؔ کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے تو بالکل ابتدا میں اعلان جنگ آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا۔ اکبرؔ نے فی الفور ایک نظم کہی ایک مصرعہ یہ تھا ع

بحمد اللہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلے میں گولی چلنے اور مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ تازہ تھا۔ خون شہیداں کی تلمیح اس جانب بھی گئی۔ اور شاعر دھر لئے گئے۔ اکبرؔ صاحب بھی بڑے شاعر تھے کوئی دار و زنداں کے مرد میداں تو تھے نہیں۔ اعلان کردیا کر بہت اچھا آئندہ شعر گوئی بجائے تو یہ، نمعلوم کس وقت کیا نکل جائے اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں۔ لیکن رند قدح خوار کی طرح شاعری کی توبہ کیا اور رہئے دن کی؟ توبہ کیجئے! اخیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی۔ لیکن تخلیہ کی صحبتوں میں قاضی و محتسب کی دسترس سے دور، مشغل اس وقت بھی جاری ہی رہا۔ ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سینہ ادھر ایسے کہ سہیں جور زحل بھی کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی
حکم اکبرؔ کو ملا ہے کہ نہ لکھو اشعار خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

جنگ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں خالی نہیں۔ نئی نئی تشبیہیں میدان جنگ سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
میرا تقوی کہاں تک اکڑ رہے بلجیم بن کر[1]

یہ کونسلیں یہ اسمبلیاں یہ ووٹ بازیاں اور الیکشن جنگیاں یہ علامت ہیں ہماری ترقی و آزادی کی یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے اور ہمارے حق میں مزید پھندے ہیں؟ اکبرؔ کے ہاں یہ تعلیم بار بار اور وضاحت کے ساتھ ملتی ہے ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا	اچھے اچھے ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ	اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی ہیں ہاتھا پائی	سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی	ووٹ کی دھن میں بن گئی پھرکی

ایک دوسری جگہ ان کی دور اندیشی قوم کی غفلت و کوتاہ بینی کی مرثیہ خوانی یوں کر رہی ہے۔ تاسف و دلسوزی کا رنگ اب اور گہرا ہے ؎

ہاؤس تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالیسی کا	لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
بے وقت لیکن اس پر مغرور ہو رہے ہیں	ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اس قبلۂ وجاہت کا انتشار دیکھو	اس باغ میں خزاں کی اکبرؔ بہار دیکھو
لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں	اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

ایک اور مقام کی شاعرانہ دور بینی اور حقیقت سنجی اس ظاہر فریب

---

[1] پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حملہ فرانس پر بلجیم کے راستے سے ہی ہوا تھا اور بیچارہ بلجیم پہلی ہی زد میں گر گیا تھا۔

اور خوش علاف منظر کو یوں بے نقاب کر رہا ہے ؎

لیڈر ہے نمود ہی کا محتاج
کونسل تو ہے ان کی جنس کا ہے رلج

کہتے جاتے ہیں یا الٰہی — سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں — اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل نہ دین ہے نہ دنیا — پنجرے میں پھدک رہی ہے مینا

"اسکیم"[1] کا جھولنا وہ جھولیں
لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

مئی و جون کی گرم گرم لو اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں۔ قاضی و محتسب کی دھر پکڑ گرما گرمی دیکھ شاعر عزیب کو تو اپنی خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ زبان بند رکھی جائے اور رہات کرنے کے لئے انتظار کسی مناسب موسم کا کیا جائے۔ بے فصل اگر بیج ڈالا جائے تو تو پودا ہرگز نہ اُگے گا۔ کہتا ہے کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہے اسی طرح ایک موقع سکوت اور بے تعلقی کا بھی ہوتا ہے اور آج وہی موقع ہے ؎

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن — کس سے کہئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو
داستانِ غمِ دل کون کہے کون سنے — بزم میں موقعِ اظہارِ خیالات تو ہو
عدم نشو و نما سے نہ کہو تخم کو بد — وقتِ بالیدگی تخم نباتات تو ہو

تینوں شعر سوز و درد کی تصویر ہیں اور انفرادی و اجتماعی دونوں

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کی "مانٹیگو رفارم اسکیم" کی طرف جس کا چرچا ہر جگہ تھا۔

پہلوؤں کو لئے ہوئے پھر کہتا ہے کہ اگر زمانے نے مساعدت کی تو کبھی ہماری بھی زبان کھلے گی، ورنہ یہ سکوت، سکوت اجل سے ہم آغوش ہو رہے گا ۔

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے
ہوا ہی بدلی ہوئی ہے فلک سے کون لڑے
خدا ہی ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے
ابھی تو چپ ہیں کوئی لاکھ اعتراض ہی جڑے
اگر اٹھے تو علم اپنا گاڑ لیں گے کہیں
جو اٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم خود ہی گڑے

حق پرستوں کے لئے کھلے ہوئے راستے تو دو ہی ہیں یا سیدھے سادے اس دار فانی سے رخصت ہو جائیں اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ۔

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے
اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط اک جبر ہے

فرماتے ہیں کہ مومن کے لئے فضا یکسر تاریک، ماحول تمامتر ناسازگار جو بھی ہوا چلتی ہے ناموافق، اہل ایمان کے لئے یاس و حرماں میں بھی گھر وسہ صرف رحمت باری کا، تاریک خانہ میں یہی شعاع امید ۔

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھپک، جب منہ میں زباں جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے
کیا ناز ہو اس ساعت پر، افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے یا کچھ نہ کہے۔ یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے
قاتل کو بھروسہ قوت کا، اور ہم کو خدا کی رحمت کا

ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی گیا۔ وہ بھی نذر کا ہم کبھی نہ ڈرے

صاحب کا ساتھ دیجئے تو دین رخصت، بے نیازی اختیار

کیجئے تو دنیا رخصت ؎

بے گزٹ ہو کے چلئے تو محلہ میں حقیر
باگزٹ ہو کے رہئیے تو فرشتوں میں خفیف

"گزٹ" کے لفظ سے بھی اکبرؔ نے خوب کام نکالے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بے سرکاری تعلق کے بغیر سرکاری اعزاز کے رہیئے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا؟ مادی تعلق منصب و اعزاز کو نظر میں رکھئے تو پھر دین سے ہاتھ دھو بیٹھئے۔

اور تو اور اب اپنے کو محض مسلمان کہنا اور کہلانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ ادھر آپ نے اعلان اپنے اسلام کا کیا، ادھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اور آپ مضحکہ کے ہدف بننے لگے۔ مسلمان کہلانے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو خیر پھر اپنے کو بندۂ تجدد یا "صاحب زدہ" مسلمان کہلائیے ؎

جو پوچھا مجھ سے دور چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوف قہر یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
و لیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

لیکن اس ساری پستی و ادبار کے اسباب اکبرؔ کی تشخیص

ہیں خارجی نہیں داخلی ہیں۔ جن مصائب کے ہم شکار ہو رہے۔ یہ خود ہمارے ہاتھ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا اغیار ہم پر دلیر ہو گئے۔ ہم نے اپنے ملی طور طریقوں کو خیر باد کہہ اغیار ہم کو اگلنے لگے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید و نقالی شروع کی۔ بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑ جب تک بندھی ہوئی ہے تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے۔ ادھر اس کا سنگا کھلا ادھر ایک ایک سینک ہوا کے ہر معمولی جھونکے کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شئے تو صرف قوم و ملت میں خودی و خود داری کا احساس ہے۔ اقبال کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہ ہے لیکن اس کی جھلکیاں اکبر کے یہاں بھی موجود ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

طریق حکمت و تزئین ہر ایک رنگ میں ہے ۔۔۔ نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے

نگاہ غور کرو ہوئے ترکی و ایران ۔۔۔ نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویران

تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گمان آئے ۔۔۔ تمہارے جسم میں کیا دوسروں کی جان آئے

جو تو نے بھائیوں اپنے ساتھ چھوڑ دیا ۔۔۔ تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا

جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں اسے کھل کر ۔۔۔ کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو مل جل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبال مند نظر آتے ہیں۔ ان کی بھی اقبال مندیاں، خوش بختیاں، کامرانیاں، کب تک؟ کے دن کے لئے؟ ایک دن احتساب کا آخران کے لئے بھی آنے والا ہے۔ جہان فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر، کبھی کبھی ان بدمستوں کے کان تک پہونچا دیتا ہے ؎

مجبور بدلتے جانے پر یہاں اقبال و حشم کے دور بھی ہیں

یکتائی کا دعوئی خوب نہیں، اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ فقیر مدہوشانِ غفلت کے قصر و ایوان کے سامنے آکر صدائے عبرت بلند کرتا ہے ؎

ہر چ کیا وقعت نہیں میری جو بزمِ غیر میں — غیرتِ مسلم ہے اس کی کس مپرسی دَیر میں
تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ روس[۱] — شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دَیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد — لیکن اڑ جاتی ہیں ساری عظمتیں دو فیر میں

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدودِ انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے ؎

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو — ساتھ رہنا ہے اس ملک میں، اے ہم وطنو
اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو ترقی — آسمان تنگ ہو تم پہ مگر اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اس وقت کا ہے جب پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر (نومبر ۱۹۱۸ء) میں صلحنامہ مرتب ہو رہا تھا۔ اور اس کا خاص اہتمام تھا کہ ابکی یورپ کی تنظیمِ جدید کا جو قبا تیار ہو اس کا دامن بھی ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے ؎

کورانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ ان کو دینگی نہیں
نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں بدلیں گی نہیں

دوسرا مصرعہ اپنی بلاغت، ایجاز و جامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت حاصل کرے۔

---

[۱] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہو گیا۔ زار روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعونِ باسامان اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا۔

آج جنہیں اپنی طاقت و توانائی پر غرہ ہے کیا انھوں نے بھی خیال نہیں کیا کہ شمع نے دم بھر میں سینکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں۔ لیکن خود صرصری کے ایک طمانچہ کے سامنے مقلب بے نور تھی۔ ہاتھی نے ایک قدم اٹھاتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا لیکن قضا الہی کے بیل تن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے تو وہ خاک تھا۔ طاقت ور والے نے کمزوروں کو زبردستی نے زبردستوں کو، سرمایہ دار والے نے ناداروں کو تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے۔ لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، روم کے قیصروں کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، اسیریا کے ویرانے، مذبوح و مقتول آخری زار روس کے جسم کی تڑپ اور زندہ درگور قیصر جرمنی[1] کے دل کی حسرتیں دیں گی۔ اکبرؔ کا مرقع سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج ان کی
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں

سنت الہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینۂ ظلم و ستم و جور غرق ہو کر ضرور رہتا ہے لیکن شروع میں نہیں۔ قہر و انتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اس وقت ہیں جب پہلے خوب مہلت مل چکتی ہے اور کبر و رعونت، خود فراموشی و خدا فروشی کی کشتی حد سے زیادہ بھاری ہو چکتی ہے۔ اکبرؔ کی ذہانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامان شرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کر رہا ہے جب تک اس طغیانی و تمرد کی کشتی پوری طرح گران بار نہ ہو

---

[1] سنہ ۵ء

چلے گی، غضب الٰہی جوش میں نہ آئے گا۔ گویا اس مشغلہ میں دیر تک مصروف رہنا آنے والے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

یورپ کو پالیسی ظلمت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

اس تمام سیاسی کش مکش و بین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہونے والی ہیں ان سے تو اب انکار نہیں البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی۔ "صاحب" اور "صاحب نجوں" کا کہنا ہے کہ آخری جیت، ہمت و حوصلہ مندی، باقاعدگی، علم و روشن خیالی، تہذیب و شائستگی کی رہنا یقینی ہے۔ اکبرؔ کا فیصلہ یہ ہے کہ سنت الٰہی آخری تائید اس فرق کی کرے گی۔ جو نیکوکار ہے اور حسن عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے۔ استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظ خشک میں بھی زندہ دلی کی ادائیں بھر دی ہیں ؎

شامت آئی ہے کہ مسلم ہے	بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی
میری جانب اشارہ غالب ہے	یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی
خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو	کھل ہی جائے گا آئی ہے جس کی

اہل ملک کے لئے اس صورت حال کا آخری علاج کیا ہے؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اکبرؔ کی تشخیص اور طریق علاج سب سے مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا کس نے اسے مجبور کیا؟ کسی نے بھی نہیں۔ بجز خود اس کی ہوس وطمع کے۔ اکبرؔ بے نیازی، بے طمعی، بے غرضی کا آئیڈیل مطمع نظر پیش کر کے سیاسیات کے پردہ میں گویا تصوف کی تعلیم دئے جاتے ہیں ؎

ہو مجھ پہ بتوں کی چشم کرم، دل کو یہ طلب اصلاً نہ رہی
مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی، ان کو جو مری پروا نہ رہی
دنیا کا تردد جب تک تھا، جب تک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر ہم ہو گئے کم، رغبت نہ رہی، دنیا نہ رہی
سچ پوچھیے تو راحت ہی ملی، دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اداسی بھی تو ہو، آفت تو مگر برپا نہ رہی

تحریک ترک موالات جو ان کے زمانے میں چلی اکبرؔ اس سے صرف کسی حد تک متفق تھے۔ تحریک کے علمبرداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے کہتے تھے یہ بھی کوئی جنگ ہے کہ روٹی نہ ملی، نوکری نہ ملی، تو حکومت سے بگڑ بیٹھے اور روٹھ کر لگے جھنجھلاہٹ میں غصہ اسی پر اتارنے۔ مولوی ہوں یا کوئی اور، جھنجھلاہٹ وہی جھوک کی ہے۔ ذرا دیکھیے گا کس لطافت کے ساتھ اس گلکدہ کو پیش کر رہے ہیں ؂

نئی روشنی کا ہوا تیل کم	حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے	نہ آفس میں اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے	سیاسی کیمپ میں پل جائیے
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور	خدا جانے نکہت ہے اس میں کہ نور

حضرت اکبرؔ نے شخصاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کے سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا۔ ان کا قبلہ مقصود وطن کے بجائے آخرت، ملک کے بجائے دین اور قوم کے بجائے خدا تھا۔ اس لیے مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں وہ خاموش رہتے۔ اور اسی خاموشی کی تعلیم دوسروں کو دیتے ؂

آزادی کا شور مبارک	بہ تقلید تھا زور مبارک

میرا تو ہے اور ہی منظر　　　میں تو کہتا ہوں اکبرؔ
عارف کو بے ہوشی زیبا　　　عاقل کو خاموشی زیبا

ان کے خیال میں سیاسی، ملکی، ملی، اجتماعی ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی۔ طاقت عبادت، عبدیت، مومن کے لئے ابتلاء و آزمائش کا وقت لازمی ہے۔ مومن وہی ہے جو آزمائش میں پورا اترے اور مرض کی انتہائی شدت کے وقت بھی نظر شافی مطلق پر رکھے۔ اس مضمون کو لیکر پوری ایک غزل کہہ ڈالی ہے

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ　　　مایوس نہ ہو دعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں　　　مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقت بے حجابی　　　تم پیروی حیا کئے جاؤ
امید شفا خدا سے رکھو　　　کیوں ترک کرو دوا کئے جاؤ

غلامی و محکومی کا راز یہ بتلاتے ہیں کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے۔ سلطنت و حکومت تو مادی حیثیت سے خلافت و نیابت الٰہی ہے۔ آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کر لیں تو مادی غلبہ ابھی حاصل کر لیں ہے

قوت ایماں سے کہدو سب کو سمجھاتی رہے
نیکیاں کثرت سے ہوں مغلوبیت جاتی رہے

اس حقیقت کا مشاہدہ تاسف و حسرت کی نظروں سے کرتے تھے کہ نام وطنیت و قومیت کا لیکر ساری دنیا کا کیا مشرق اور کیا مغرب، محض مادی عرض مندیوں کے لئے ایک دوسرے سے مصروف کارزار ہے۔ خوف خدا اور حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جا رہا ہے

اور اس لئے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہو رہا ہے ؎

دینِ خدا ہے حق کی تسلی کے واسطے — دنیا اٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ کے ساتھ — اللہ ہی ہے ان کی تسلی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج و زوال زمانہ کی معمولی دھوپ چھاؤں ہے یہ آج اس قوم کا طبلِ اقبال بج رہا ہے کل اس قوم کا دولت کا تاج آج ایک قوم کے سر پر ہے کل دوسری کے۔ یہ مد و جزر، زمانہ کے سمندر میں ہر وقت اور ہر آن لگا رہتا ہے۔ ترک اگر اس وقت حکومت سے بیدخل کئے جا رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں[1]۔ ماتم انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہمارا عزم، غیرت و خودداری، صدق و ثبات، ہم سے رخصت ہو رہا ہے اور ہم روز بروز بجائے توفیقِ الٰہی کے اور قوتِ ذاتی پر اعتماد کرنے کے دوسروں کے محتاج و دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ حسرت ہماری اس قلب ماہیت پر نوحہ کرتی اور عبرت آنسو بہاتی ہے ؎

انقلابی بات ہے یہ ہوتی رہتی ہے یونہی — اس کا کیا شکوہ جو ہم پر اس کو غالب کر دیا
ہاں یہ ہے افسوس ہم سے چھن گیا صبر و قرار — طالبِ حق کو فلک نے سب کا طالب کر دیا

---

[1] ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء کا زمانہ یاد کیجئے ترک اس وقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے سب سے بڑے اور زبردست نمائندہ تھے سلطان المعظم اس وقت تک خلیفۃ المسلمین تھے اور خادم الحرمین الشریفین ترکوں کو جنگِ عظیم اول میں جو شکست ہوئی یہ محض ایک سلطنت یا جغرافیائی اقلیم کی شکست نہ تھی عالمِ اسلام نے اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضربِ کاری سمجھا۔ ہندوستان میں عظیم الشان و بے نظیر مگر زود فنا تحریک، تحریکِ خلافت کے نام سے اٹھی وہ اسی احساس کا نتیجہ تھی۔

اس وقت دنیا صرف اخبار پر تھوڑی سی مسلط ہے۔ خود ہماری ساری
جدوجہد کا مرکز بھی تو دینا اور دنیا محض رہ گئی ہے۔ اس سے آگے کی دوربینی
رخصت۔ فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سے سررشتۂ صبر بہر حال نہ
چھوٹنے پائے ؎

درماں بقدر طاقت ہر سو نکل رہے ہیں
"صاحب" تو اڑ رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں
غصہ میں ہیں ہم ان پر وہ ہم پر ہنس رہے ہیں
دام فریب دنیا میں دونوں ہی پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہیئے یہ طاعت سے منہ نہ موڑیں
وہ اپنا جبر چھوڑیں ہم صبر کو نہ چھوڑیں

تحریک ترک موالات کو درجہ قبول صرف اس وقت حاصل ہو
سکتا ہے جب اس کے ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمہ عبودیت ہو نہ یہ کہ اس کی
بنا خود بینی پر ہو کہ یہ تو عین انانیت ہوتی ہے[1] ؎

---

[1] جولائی سنہ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا آہ کہ وہی ملاقات آخری تھی
اپنے اس وقت کے اکثر نوجوانوں کی طرح نشہ تحریک خلافت اور ترک موالات
کا سوار تھا۔ مہاتما گاندھی کی روحانیت اور تقدس کے تذکرے ورد زبان تھے
بات بات پر ان کی بزرگی اور روحانیت کا حوالہ۔ دل میں آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی
جادو چل جائے اور وہ بھی نان کوآپریشن کی کمیٹی کے باضابطہ ممبر بن جائیں۔ حضرت
نے دو چار منٹ تو صبر کیا اس کے بعد یک بیک پوچھ بیٹھے "اچھا صاحب آپ کے
بیان سے تو معلوم ہوا کہ گاندھی جی بڑے موحد اور روحانیت کے علم بردار ہیں (بقیہ ص ۷۹ پر)

تو اب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم — کہ دل کو طاقت حق سے دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش ہمیں مرے ہیں یہ خلل انداز — ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی۔ ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے تو تحریک ترک موالات سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں اس کی "خانگی" حیثیت پر نظر کر کے اسے خود انہی کی زبان سے سنیئے ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبرؔ اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سنا کر بولے کہ "یہ بھی آپ سمجھے ہیں نے مدخولۂ گورنمنٹ کیوں کہا؟ پینشن پاتا ہوں نا! ملازمت میں ہوتا تنخواہ پاتا ہوتا تو مدخولہ نہیں منکوحہ کہتا۔"
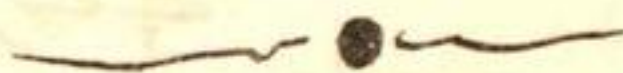
بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸ سے آگے) اپنی اس کمیٹی میں انھوں نے داخلہ کی پہلی شرط لا الہ الا اللہ تو ضرور رکھی ہوگی؟" میں ساری چوکڑی بھول گیا۔ مری ہوئی آواز میں جواب دیا کہ "جی نہیں ایسا تو نہیں۔" بولے تو بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آجکل ہیں۔"

(ج)

عشق و تغزل

اکبر کی شہرت عام غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیات اول و دوم میں ان کی متعدد غزلیں اچھی سے اچھی موجود ہیں۔ ایسی کہ ان کی بنا پر انہیں بلا تامل غزل اردو کے استادوں کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے۔ کلیات اول کا سال طبع ۱۹۰۹ء ہے۔ اس میں حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قائم کئے ہیں۔ سلسلۂ بیان کے لئے ان میں سے ہر دور کے نمونۂ کلام پر ایک سرسری نظر کرتے چلیے۔

پہلا دور تا ۱۸۶۶ء۔ اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ گویا یہ دور ان کی شاعری کے بچپن کا تھا۔ شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا، یہ سن بھی کوئی سن ہے۔ اپنے اور اپنی شاعری دونوں کے اس لڑکپن میں وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہم نوا ہیں۔ تاہم برجستگی، شوخی بیان، روانی طبع اور لطف زبان کے جوہر آگے چل کر اس آب و تاب سے چمکے۔ اس وقت بھی بعض وغیر نمایاں نہیں۔ اور رعایت لفظی لکھنؤ کے رنگ کی بھی خاصی موجود ہے۔ اشعار ذیل کے پڑھتے وقت یہ خوب یاد رہے کہ زمانہ ۱۸۶۶ء اور اس سے قبل کا ہے۔ اودھ میں انگریزی نئی نئی قائم ہوئی ہے۔ نوابی کو رخصت ہوئے ابھی چند سال ہوئے ہیں۔ اودھ بلکہ ملحقات اودھ

ہیں نئی زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً شعر و ادب میں پرانے لکھنؤ کی خوبو پوری طرح باقی ہے، بلکہ وہی مذاق ابھی تک حاکم ہے ؎

بے تکلف بوسۂ زلفِ چلیپا لیجئے | نقدِ دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا کیجئے
دل تو پہلے لے چکے اب جان کے خواہاں ہیں آپ | اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجئے
پاؤں پھیلا کر کہتی ہے زنجیرِ زنداں میں رہو | وحشتِ دل کا ہے ایما، راہِ صحرا لیجئے

سنتا ہوں چمن میں جو تیری زمزمہ سنجی | یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

دوسرا مصرعہ طرحی تھا ؎

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی | یہ وفا کیسی تھی صاحب یہ مروت کیسی
کوچہ یار میں جا تا تو نظارہ کرتا | قیس آوارہ ہے جنگل میں یہ وحشت کیسی

جذبۂ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہے | گھنگھروؤں کی جانب درِ کچھ صدا آئی تو ہے
عشق کے اظہار میں ہرچند رسوائی تو ہے | پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے
آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں | بے تکلف آئیے کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۷ء تا ۱۸۸۴ء۔ رندی معاملہ بندی و ہوسناکی کے مضمون اس دور میں بھی باقی ہیں۔ لیکن جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ رنگ تغزل پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گیا ہے اور لطف زبان و حسن بیان کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔

فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

آج آرائشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے | پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے

شوقِ پابوسیِ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز
گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں؟
سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے
جان کیونکر ہدفِ تیرِ قضا ہوتی ہے

ہوں قریب ستمِ یار کا قائل اکبرؔ
مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

ردیف کے خفیف فرق کے ساتھ اسی زمین میں ایک مشہور غزل امراؤ جان ادا والے مرزا رسوا لکھنوی کی ہے۔ اکبرؔ کی غزل اسی کے ٹکر کی ہے۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ ان سے ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے انکا
لیکن وہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

دوسرے شعر خصوصاً اس کے دوسرے مصرعہ میں اکبرؔ کی معنویت پوری طرح جلوہ گر ہے اور چوتھا شعر تو گویا اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

یاں نے کچھ خبر نہ لی دل نے جگر سے کیا کیا
نالۂ شب سے کیا ہوا، آہِ سحر نے کیا کیا

کھل گیا سب یہ حالِ دل ہنستے ہیں دوست برملا
ضبط کیا نہ رازِ عشق دیدۂ تر نے کیا کیا

دورِ سوم ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۰ء۔ دور کا کلام رنگِ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے۔ طرزِ ادا میں سنجیدگی بڑھ گئی ہے۔ مضمون آفرینی پر توجہ زیادہ ہو گئی ہے۔ غزل میں اخلاقی و روحانی مضامین کی آمد بے تکلفانہ شروع ہو گئی ہے۔ ظرافت کا چٹخارہ بھی جا بجا موجود ہونے لگا ہے۔ پھر بھی تغزل کا رنگ مسلم و مستند اور ثقہ استادوں کا تھا۔ اس سے مجال نہیں کوئی

مصرعہ الگ جا پڑے۔ ملاحظہ ہو ؎

دل لگے جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس — ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر — مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

دل مرا ان پہ جو آیا تو قضا بھی آئی — درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا — میں بھی آیا ترے گھر میری بلا بھی آئی
وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی — بت کو دیکھا تو مجھے یاد خدا بھی آئی
ہوئیں آغاز جوانی میں نگاہیں نیچے — نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا — میں مریض ہوش تھا ہستی نے اچھا کر دیا
نشان محبوبی صانع کا نشاں رکھا ہے — ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
کیا مرے اک دل کے خوش کرنے پہ قادر ہیں نہیں — ایک کن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے ہوش و خرد وہم و تمیز — خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردا کر دیا
شاید بزم ازل نے اک نگاہ ناز سے — عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا
شور شیریں کا مزہ رکھا سر فرہاد میں — قیس کو دیوانۂ انداز لیلےٰ کر دیا
گردن پرواز میں ڈالی کمند شوق شمع — رنگ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا
جس نے یہ سب کچھ کیا اکبر میں تم سے کیا کہوں — اس نے مجھ کو کیا کیا، دل کو میرے کیا کر دیا

وہ حجاب ان کا آج تک نہ گیا — نہ گیا ان کے دل سے شک نہ گیا

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی ۔۔۔ وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا ۔۔۔ اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا

ایسے ستم کیے کہ مرا قلب ہل گیا ۔۔۔ اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا

تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا ۔۔۔ بلبل کو وجد آ گیا، غنچہ بھی کھل گیا

خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز ۔۔۔ اپنے ہی دل میں مجھ کو مرا رب بھی مل گیا

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے ۔۔۔ مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی ۔۔۔ ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

ادراک نے آنکھیں سب اوہام میں کھو دیں ۔۔۔ واقف نہ ہوا روشنی صبح ازل سے

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے ۔۔۔ کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے[1]

حکم آیا ہے جو خموشی کا تو بس حشر تلک چپ ۔۔۔ ہیبت ترے پیغام کی کی ظاہر ہے اجل سے

درجہ تحیر کا ہے بیخودی سے فروتر ۔۔۔ ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

---

[1] یہ غزل حضرت اکبر نے لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرہ میں پڑھی۔ عمائد لکھنؤ میں اس وقت ایک مشہور بزرگ مفتی اطہر علی کاکوروی تھے۔ صاحب علم و صاحب دل۔ وہ بھی مشاعرہ میں موجود تھے۔ اکبر برسوں بعد کو بیان فرماتے تھے کہ جب میں اس شعر پر پہونچا ابھی پہلا ہی مصرعہ زبان سے نکلا تھا کہ نظریں مفتی صاحب سے چار ہو گئیں۔ ان کے تیور پر بل تھے کہ قرآن اور خدا تک سے شوخی۔ میں نے عرض کیا کہ مصرعہ ملاحظہ ہو۔ یہ کہکر جو دوسرا مصرعہ پڑھا تو مفتی صاحب "حسن" کی تشریح حسن عمل سے سن کر پھڑک اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔

بحث کہن و نو میں سمجھتا نہیں اکبر — جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے

یہ تین دور تو خود اکبر کے قائم کئے ہوئے تھے۔ کلیات اول کے زمانہ تک۔ اب اس کے بعد دور چہارم سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک سمجھئے۔ یہ کوئی مستقل دور نہیں ہے دور سوم کا تکملہ ہی سمجھنا چاہئے۔ دور سوم تک کا کلام کلیات اول میں موجود ہے اس کے بعد کا چار سال کا کلام کلیات دوم میں ہے۔ بس اس لئے اس حصہ کے لئے ایک جداگانہ دور قائم کرنا پڑا۔ سنہ ۱۹۰۹ء تک غزل میں جتنی پختگی آنا تھی آچکی تھی۔ شاعر کی عمر اب ۶۰-۶۲ سال ہو چکی تھی۔ اور اس کا شمار اب استادوں میں تھا۔ اس کے بعد صنف غزل میں کسی جدت کی نہ توقع تھی اور نہ کوئی جدت واقع ہوئی۔ کیفیت وہی قائم رہی۔ البتہ کمیت کے لحاظ سے یہ فرق ہوا کہ کلیات اول میں بڑا حصہ غزلوں ہی کا ہے۔ کلیات دوم میں اول تو یہ تناسب گھٹ گیا ہے اور پھر جتنا حصہ غزلیات کا ہے بھی۔ اس میں بھی معاملات صرف عشق و محبت ہی کے نہیں بلکہ اخلاق، معاشرت، فلسفہ، سیاست، تصوف، معرفت، سب ہی کے مضمون شامل ہیں۔ باایں ہمہ اس دور کا عاشقانہ بھی کسی اعتبار سے بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔ لطف دیکھئے ایک ایک سطر سے نمایاں۔ پختگی اور شگفتگی کے ثبوت ہر ہر صفحہ پر مضمون کی آفرینی اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پھوٹا پڑتا ہے۔ طبیعت کی آمد ندرت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی جدت کی بہار دکھانے لگتی ہے ؎

اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا — وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا

یا اس نے خوب سمجھا یا اس نے خود دیکھا — اس نے خدا کو مانا، وہ ہو رہا بتوں کا

نہ یہ رنگِ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا — یہ جنوں اگر نہ ہوتا، تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غمِ دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا — مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ دیکھ کے فطرت نے ہیں نقش کھینچے ورنہ — نہ یہ ہوتی چشمِ نرگس نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دیں سب اس کے صدقے جو وہ خود نما ہے — کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
حسن نظامی اکبر کا کلام سن کے بولے — تجھے میں ولی سمجھتا جو خرقہ پوش ہوتا

بتوں سے میل، خدا پر نظر یہ خوب کہی — شبِ گنہ و نمازِ سحر یہ خوب کہی
تمہاری خاطرِ نازک ہے خیال فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر یہ خوب کہی
شباب و بادۂ فکرِ مآل کار چہ خوش — جنونِ عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی
سوالِ وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی — وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر یہ خوب کہی

آہ دل سے جو نکالی جائے گی — کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یاد ان کی ہے بہت عزلت پسند — آہ بھی دل سے نکالی ہو جائے گی
نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں — حشر کہتا ہے منائی جائے گی
یاد ابرو میں ہے اکبر محو کیوں — کب تری یہ کج خیالی جائے گی

اک صوتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے — ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ بڑھ جائے نہ عکس — شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہے
حضرت منصور کہتے ہیں "انا" بھی حق کیا تھا — دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

(یہ تبصرہ منصور حلاج کی پر شور معرکۃ الآرا بحث میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت "تکلیف شرعی" کی اصلاح ذہن میں رکھیے)

شوقِ وصل شعلہ رو، ہاں کیوں نہ ہو برسات میں | ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی | واعظ کی بات رہ گئی، ساقی کی چل گئی

تیار تھا نماز پہ میں سن کے ذکر حور | جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے | صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام | پروانہ بے قرار ہوا، شمع جل گئی

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انھیں | پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دور پنجم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء - اس دور کا کلام کلیات سوم میں ہے۔ اور یہی تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ شاعر کی عمر اب لگ بھگ ستر سے اوپر ہے۔ اور اب وہ شاعر سے کہیں زیادہ مفکر ہے دل شاہد و شراب و چنگ و رباب کے تذکروں سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ معرفت اور عشق حقیقی کی آگ بھڑک چکی ہے۔ رواجی مجازی تغزل کا رنگ ہلکا پڑ چکا ہے۔ غزل کہنا بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا تھا۔ عموماً سیاسی، اخلاقی، عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ عنوان غزلیات کا کلیات سوم میں بھی خاصہ بڑا نظر آتا ہے لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے۔ عموماً وہ واقعات حاضرہ پر شاعر کے خیالات اور تبصرے ہیں۔ صرف غزل کے سانچے میں انھیں موزوں کر دیا گیا ہے یہ خصوصیت موجود تو ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی ہے۔ درمیانی کلام میں بڑھ گئی تھی۔ اور آخر زمانہ میں تو یہی خصوصیت دوسری خصوصیتوں پر چھا گئی اور غالب آ گئی۔ کلیات اول کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے پر ایک ناقد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ:-

"مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تفکر دسوچنے والا صاحب فکر، یا فلاسفر ہے۔ جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے بڑی پسند آئی۔ اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے اور واقعہ ہے بھی یہی۔ کہ جوں جوں ان کی شاعری نکھرتی گئی وہ روز بروز اس خیال کے مصداق زیادہ سے زیادہ ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر کلیات سوم کی دو ایک غزلیں درج ذیل ہیں ان سے معلوم ہوگا کہ قالب اگرچہ غزل کا ہے لیکن روح بھی ذرا بھی غزل کی نہیں (غزل اپنے عام عرفی و مقبول معنے میں) جام و سبو کی شکل بن جائیے۔ تو اب بھی ہر طرح شراب ہی شراب نظر آئے گی۔ لیکن دیکھ کر دیکھئے تو آپ خود ہی پکار اٹھیں گے کہ "استغفر اللہ" شراب خانہ خراب کیسی، یہ تو گلاسوں میں طریقت و معرفت کا آب طہور جھلک رہا ہے۔ ظرافت کی چاشنی سیاسیات کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آرہی ہے۔

ذیل کی غزل کو آپ غزل کہیں گے۔ یا ایک درس تصوف؟ "سخن باز نان کفتن"، اگر غزل کی تعریف ہے تو یہ غزل کسی معنی میں بھی ہے؟

نگاہ اٹھی ہے احساس ماسوا کے لئے ۔۔۔ کہاں ہے دل ذرا روکے اسے خدا کے لئے

رواں ہو کار جہاں کیوں ہماری مرضی پر ۔۔۔ خدا کے لئے ہے کہ ہم خدا کے لئے

عمل خدا کے لئے ہو تو اس کا کیا کہنا ۔۔۔ مگر رہا یہ بری حرف واہ واہ کے لئے

لیلائے تغزل کے مجنوں کے دور سے محل کو دیکھ کر شوق سے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ پاس آکر اندر جھانکتے ہیں تو نہ کوئی عشوہ فروش ہے نہ کوئی زہرہ زہیں۔ بلکہ ایک شیخ وقت تسبیح و تہلیل میں مصروف نظر آتے ہیں ؎

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں ۔۔۔ نہ صرف آپ میں ہم ہیں تمام عالم میں
اسی کا نام نہ کیوں مرکز زباں ہو جائے ۔۔۔ کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں
خدا پرست کو کافی ہے مثل ابراہیمؑ ۔۔۔ زوال شمس و قمر ہو کام عالم میں
یہی مشن تھا جناب رسول اکرمؐ کا ۔۔۔ اور آج انھیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

چنگ و رباب کے سیاہ دور سے باجے گاجے کی آوازیں سنا دور رہے ہوئے آتے ہیں کہ چلیں اندر سبھا کے ناٹک کا لطف اٹھائیں۔ جلوہ گاہ کا پردہ جب اٹھتا ہے تو دیکھئے وہ سارا تخیل ہی برباد۔ نہ مطرب ہے نہ ساز، نہ ساقی ہے نہ اس کا انداز، محفل میں بجائے ساز کے سوز ہے۔ لبوں پر بجائے واہ کے آہ ہے۔ طبلہ کی تھاپ کی جگہ ضربیں اللہ ہو کی لگ رہی ہیں چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے خشیت الٰہی۔ درمیان میں ایک صاحب حال درویش اپنی آگ سے دوسروں کو گرما رہے ہیں۔ ؎

کوشش ہو لاکھ عشق نے کی، بو اس کی نہ نکلی محفل سے
مجنوں نے اڑائی خاک بہت۔ لیلیٰ نے نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال باری کو
پروانہ کو مطلب شمع سے ہے۔ کیا کام ہے رنگ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہ ہوا۔ فریاد و فغاں ہی کیا کرتا
جس وقت کہ خنجر تھا گلا۔ آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

طبیعت زہد خشک سے اکتا چلی ہو۔ اور دل میں ظرافت کی گدگدی اٹھ رہی ہو تو اس رنگ کو لینے بھی کہیں دور نہیں جانا ہے۔ قدرت قوافی کے طلسم ساز کے لئے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے اس رنگ کا کلام بھی غزلوں ہی کے تحت میں موجود ہے ؎

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے　　صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں　　کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

غرض آخری دور کا جو کلام غزلیات کے زیر عنوان رکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ بس وہ نام ہی کی غزلیں ہیں۔ باایں ہمہ جب غزل سرائی پر آئے ہیں تو پورے عاشق بن گئے ہیں۔ جو کچھ عاشقانہ رنگ میں کہا ہے خوب کہا ہے اپنے مرتبہ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے اور درجہ استادی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ لطف زبان سلامت بیان ان کی غزل کی جان ہے۔ دشوار پسندی نے بعض بعض اچھے اچھے غزل گویوں کو غارت کر دیا ہے۔ اکبر کا گلستان ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے۔ پھر بیان لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی بھی موجود۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب و شائستگی سے غافل ہو جائیں۔ جانتے ہیں کہ قافلہ میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ اور ایسے بھی جو محل کے آب و تاب، چمک دمک سے ہی خوش کر لیں گے۔ ایسے بھی جو محمل نشیں کی زیارت کے بغیر دم نہ لیں گے۔ دونوں طبقات کے دلوں کی دوڑیں بہ فاقہ بان سخن اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔

رسمی شاعروں کے خلاف ایک غزل میں تماشہ گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں۔ اور فطرت کے کھلے میدان میں دن دوپہر وہ مزے حاصل کرتے ہیں جن کی تلاش شاعروں کو خدا جانے کہاں کہاں سرگرداں رکھتی ہے۔ اور یہ لطف انھیں خلوت میں نہیں جلوت میں بھی بہمہ وقت حاصل ہے۔ لیکن پھر آخر جذبات شاعر کے رکھتے ہیں اور اس کو مقطع میں نباہ لے جاتے ہیں ؎

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا　　کیا دلکشا یہ سین ہے فصل بہار کا

نازاں ہے جوشِ حسن پہ گلہائے دلفریب ‏ ‏ جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم بہار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب ‏ ‏ نقشہ کھنچا ہوا ہے خطِ زلفِ یار کا
سبزہ ہے یا یہ آبِ زمرد کی موج ہے ‏ ‏ شبنم ہے بحر یا گہر آبدار کا
مرغانِ باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں ‏ ‏ اور ناچ ہو رہا ہے نسیمِ بہار کا
ابرِ تنک نے رونقِ موسم بڑھائی ہے ‏ ‏ غازہ بنا ہے روئے عروسِ نہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے ‏ ‏ سودا ہے روح بحر ہے اک گلعذار کا

رسمی شاعر بے چارے معنویت سے بے نیاز، محض الفاظ کی تراش و خراش میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری پر یہ حقیقی شاعر کیسی چنیچی تلی رائے ظاہر کرتا ہے۔ رائے شاعرانہ بھی اور صحیح بھی ؎

معنی کو چھوڑ جو ہوں نازک بیانیاں
وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خوں کا

ذیل کی غزل میں تغزل کے پامال مضمونوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہونچا دیا ہے۔ آخری شعر اس پایہ کا ہے کہ کہنے والے کی نجات کے لئے بس کرتا ہے ؎

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں مقدور مرا ‏ ‏ بڑھتا جاتا ہے شمار ان کے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مرتے ہیں ‏ ‏ فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازارِ جہاں میں ہر سو ‏ ‏ کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا
فطرت اٹھی ہے شفاعت کو ملائک ہیں خموش ‏ ‏ حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا

غزلیہ شاعری کا سب سے زیادہ پامال مضمون عشق ہے ہر سخن گو کا تختۂ مشق یا تکیہ کلام۔ دفتر کے دفتر اس کی شرح میں سیاہ ہو چکے ہیں۔ اور عاشقوں کی تعداد کا کوئی شمار ہی نہیں۔ لیکن کیفیتِ عشق الفظ

وعبادت کی مدد سے کچھ بھی واضح ہو پائی ہے؟۔ اکبر اس گونگے کے خواب کی مصوری اپنے مرقع میں کرتے ہیں ؎

عشق میں حسن بیاں وجہ تسلی نہ ہوا
لفظ جمع کا مگر آئینہ معنی نہ ہوا

اکبر کے دور آخر کی غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور اس سے اپنی بے تعلقی، لذات دنیا کی بے حقیقی، یہ موضوع اکثر غزلوں میں مشترک ہے۔ ذیل کی غزلوں میں اپنی جذبات کی ترجمانی ہے۔ بعض تشبیہوں کی ندرت پر لطافت لوٹ لوٹ جاتی ہے ؎

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں — بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی — ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گذر جاؤں گا بے لوث — سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے دوا کی نہیں حاجت — غم کا مجھے یہ ضعف ہے، بیمار نہیں ہوں
وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے — الجھوں کسی دامن سے وہ خار نہیں ہوں
یارب مجھے محفوظ رکھ اس بت کے ستم سے — میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعوی تقوی نہیں درگاہ خدا میں — بت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں
افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبر — کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دنیا میں رہ کر دنیا سے بے لوث و بے تعلق رہنے کو بہت سے شاعروں نے باندھا ہے۔ لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن لطیف و دلنشیں تشبیہات کی مدد سے جو مضمون باندھا گیا ہے، وہ اکبر ہی کا حصہ ہے۔ ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے۔ لیکن اکبر چوتھے شعر میں ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی میں اسقدر لاغر ہوں کہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں

اور دوا کی فکر ہیں ہیں۔ چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی رمز اور کنائے ہیں ۔

عشق کا دم بھرنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہوں، لیکن واقعی عشق رکھنے والے دو چار ہی ملیں گے۔ آہیں سب کرتے ہیں لیکن مجنون کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ سوز عشق کی اہلیت بس مخصوص ہی اشخاص میں ہوتی ہے۔ عام خلقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہے ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں۔

سینہ میں سب کے دل ہے سب اہل دل نہیں ہیں۔

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی کہا ہے ؎

مقبول جو ہوں ستار ہیں، قابل تو بہت ہیں

آئینہ کے مانند ہیں کم،

یہ "مقبول" و "قابل" کا تقابل بھی کیا خوب!

دہ کم ہیں بار ٹڑپتے ہیں جنھیں ملتی ہے لذت   یو آپ کی شمشیر کے نسبل تو بہت ہیں

تیغ کے نسبل تو ہزار نکل آئیں گے۔ لیکن اس سب میں لذت پانے والے کتنے نکلیں گے؟ مجاز پر محمول کیجئے یا حقیقت پر۔ سیاست پر محمول کیجئے یا معرفت میں۔ بہر حال ہر پہلو سے بھی جا ہے۔ الٹ پلٹ کے اس شعر کو لیجئے۔ سیاست سے خالی کوئی بھی پہلو نہ نکلے گا۔

عاشق خوب جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں پھرنا، جان سے ہاتھ دھونا ہے۔ لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے تو پھر عاشق کیوں کہلائے۔

ذوق ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں
مہلک ابھی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اضطراب، جوش وخروش کوئی بھی شے آپ کے اپنے مقصد اختیار سے بعید نہیں ہوتا ہے۔ یہ ساری کیفیات اضطراری ہیں یہ تاثر قلب پہ سب کچھ کراتا رہتا ہے۔

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں
پہلو میں لیکن اس دل بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے کہ نظارہ گل ترک کرے تو دل قابو میں آجائے گا لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہوائی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں کب دل پر قابو رہتے دیں گی۔

داغ کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

بات میری کبھی سنی ہی نہیں — جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

اس کا یہ شعر زندہ ومعروف ہے۔

لطف مئے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اس زمین میں اکبر نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں ذرا اس کی بھی سیر ہو جائے۔

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں — آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو — مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأت عرض حال کیا ہوتی | نظر لطف اس نے کی ہی نہیں
اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا | ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں
آپ کیا جانیں قدر " یا اللہ" | جب مصیبت کوئی بڑی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا | میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں
پوچھا اکبرؔ ہے آدمی کیسا | ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" کو کس خوبی سے کھپا دیا ہے اور "سوسائٹی" کا قافیہ لانا تو اکبرؔ ہی کے حصہ میں تھا۔ گردش چرخ کا شکوہ سب ہی شاعر کرتے آئے ہیں۔ اکبرؔ نے دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھایا کہ سرے سے فلک سے کوئی آرزو ہی قائم نہیں کی۔ اور مزے میں رہے۔ پانچویں شعر میں ایک نادر مضمون باندھا ہے۔ مصیبت زدہ کی تسکین کے لئے دوسروں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے ان کی کوئی نظیر اب تک موجود ہی نہ تھی جو کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دے مصائب کے خوق ابجد ہونے کا ایک نادر پیرایہ اظہار ہے۔ چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے۔ ان کی داد نہ دینا بغیر آپ بیتی کے مدد کے ممکن نہیں۔ ایک اور غزل ملاحظہ ہو ؎

جلوۂ ساقی و مئے جان لئے لیتے ہیں | شیخ خوش ہوں کہ فضا ہم تو پئے لیتے ہیں
دل میں یاد ان کی جو آئی ہوئی شرماتی ہے | درد اٹھتا ہے کہ ہم آڑ کئے لیتے ہیں
دور تہذیب میں بیہودہ کا ہو لور نقاب | ہم بھی اب چاک گریباں کو سئے لیتے ہیں
لذت وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق | وہ مزہ کیا ہے جو بے جان ہوئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لاجواب ہے۔ عارفانہ پہلو بھی ہے۔ مضمون کتنا سچا ہے کہ بغیر درد کے ان کی یاد ہی نہیں ہو سکتی اور اب

کس بانکپن سے ادا کیا ہے۔ آخری شعر بھی اس رنگ میں ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر پھر اپنے اصل عالم میں چلا گیا ہے۔

نامانوس قافیہ لا کر کلام میں شعریت باقی رکھنا بلکہ اس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل سے یہ دولت اکبر کے حصہ میں آ چکی تھی۔ فرماتے ہیں اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اس دور میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے
اس باغ میں طوطی کے لئے کوُت نہیں ہے

پنجرا میں جوانی کو تو موجود ہی پایا
سانس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

نقطوں کی پھیر میں اب انفعل و تعلق
چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے

نیچری کا مطیع ہے بہت معتبر اکبرؔ
تم دیکھتے ہو پھیل میں کہیں چھوت نہیں ہے

اکبرؔ کا اصلی مقام معرفت و حقائق کا "لاہوت" ہے لیکن جب قافیہ کی پیمائی کے ناسوت میں اترتے ہیں تو دیکھنے والوں کو "مبہوت" کر دیتے ہیں۔ اب مزید توصیف سے "سکوت" ہی اول۔

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی اپنے ذوق کی تسکین کا سامان عجب نہیں ان غزلوں میں پا سکیں۔

عشق کہتا ہے بیان حال کی پروا نہ کر
تیرے دل کی خود بخود ان کو خبر ہو جائیگی

میں شب فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے
کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائے گی

تجھے اے امید فردا دل و جاں سے پیار کرتے
مگر اپنی زندگی کا اعتبار نہیں کرتے

ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم
میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں بیار کرتے

ترے ہاتھوں کی یہ زینت تو ہے شاخ گل سے افزوں
ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

صبر رلا جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے
ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے

کچھ نتیجہ نہ ہوا عشق کی امیدوں کا
دل کو بڑھتا ہے طبیعت تو بہل جاتی ہے

شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہوا انجام
مگر اس بزم سے سلجھنے میں تو ڈھل جاتی ہے

کتمانِ رازِ عشق یہ مرے آب و گل میں ہے
خاموش ہے زباں جو کچھ ہے وہ دل میں ہے

افعی و زلف مس کا سودا برا نہیں
پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس بل میں ہے

بل (فردِ حساب) کا تعلق "سودے" سے خاص انگریزی اردو کا ندرائی کا ضلع ہے۔ لکھنؤ کا ذوقِ قدیم اس کی زیادہ قدر نہ کر سکے گا۔ البتہ یہ افعی و زلف اور پھر دونوں کے لئے "پیچیدگی"، عجب نہیں جو اہلِ لکھنؤ ان مناسبتی پر لوٹ جائیں۔ اکبر کے سارے قصور معاف کر دیں۔ داد میں داد کے دفتر کے دفتر سیاہ کر دیں۔ لفظ لفظ کہا۔ نقطہ نقطہ کی تشریح "موبمو" کرنے لگیں۔ "بال کی کھال نکالنے لگیں اور سلسلۂ بیان دیر تک برہم نہ ہونے پائے۔

کہیں کہیں سحر اس رنگ کا بھی فرما گئے ہیں۔ جو استاد امانت کی روح کو وجد میں لے آئے۔ مثلاً ؎

اس سرو قد پر اکبر مدت سے مر رہا ہوں
اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

بیساختگی تو یہاں بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ عموماً کہتے وہی ہیں جو دل میں محسوس کر چکے ہوتے ہیں ان کی شاعری اکھاڑے کا کوئی کرتب نہیں، واردات قلب کا عکس ہے اپنے پر جو گذرتی ہے۔ وہی دوسروں کو بھی سنا چلتے ہیں خود بھی

اسے اس سے بہتر واقف ہیں۔ اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس کے اور اپنے کلام میں ہے کیا؟ ع

شعر اکبر میں کوئی کشف کرامات نہیں۔
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے اور رسمی شاعروں میں جو فرق ہے اسے بھی صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

میں اپنے آپ میں ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن ان سے سنورتا ہے، سخن سے میں سنورتا ہوں

اتنا نمونہ حضرت اکبر کے آخری دورِ تغزل کا کافی ہوگا۔ ضمناً ابتدائی اور وسطی دور کے کلام سے بھی تعارف ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد ان کے عاشقانہ کلام پر نہیں۔ دوسرے اصناف سخن پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود خاص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اردو شاعروں میں کچھ گیا گذرا نہیں کہ ان کے لئے باعث توہین ہو۔ اور ان کے پرستاروں کے لئے باعث شرم، روزمرہ، مضمون بندی اور زبان کی صفائی میں ان کی اکثر غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ اور معنوی بلند پروازیوں میں اگر وہ غالب کے ہم سطح نہیں، تو بھی مومن و شیفتہ وغیرہ کے طبقہ میں تو انھیں بے تکلف جگہ ہی مل سکتی ہے۔ مثالیں کلام کی ابتدائی اور درمیانی دور میں بکثرت ملیں گی آخری دور میں کم تر۔

(د)

اخلاق و معاشرت

اکبرؔ کے صحیفۂ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی روح یا جان ان کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات ہی ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں۔ آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اول سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ پیرایۂ ادا کی حد میں انداز بیان کی لطافت و ظرافت اور مفہوم سخن و موضوعِ کلام کو حدود میں اصلاح و معاشرت و تزکیہ اخلاق اکبر کی شاعری کے کمال و عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہے۔ لیکن ان کی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی۔ اور رفتہ رفتہ مشہور ہو کر بیسویں صدی کے شروع ہی سے ہو چکے تھے۔ ہندوستان خصوصاً مسلمانان ہندوستان میں یہی زمانہ مغربی تمدن و معاشرت، مغربی علوم، غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج مقبولیت و فروغ کا ہے۔ اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں تو اس وقت کی صورت حال کا نقشہ تفصیل کے ساتھ تصور میں لے آئیے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ کو گذرے ہوئے ابھی چند سال ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان[1] اس کا پوری طرح مزہ چکھ چکا ہے کہ زبردست کے مقابلے میں کمزور کے سر اٹھانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ملت اسلامی خصوصیت کے ساتھ اپنی غفلتوں اور عیش پرستوں کے نتائج بھگت رہی ہے۔ صدیوں تک جس ملک میں حکومت کی، بڑے کروفر کے ساتھ بڑی شان و شوکت کے ساتھ کی۔ کبھی غوریوں کے نام سے، کبھی خلجیوں کے لقب سے کبھی سیادوں کے لباس میں اور کبھی تغلقوں کا جھنڈا اڑا کر، اور آخری دو صدیاں مغلوں کے نام سے۔ اسی ملک میں مسلمان اب ذلیل و حقیر تھے۔ ہر سمت سے پٹے ہوئے چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے۔

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر کو رخصت ہوئے مدت ہو چکی ہے وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی نوبت ہی کیوں آتی ثروت و خوشحالی اول تو باقی ہی کہاں۔ جائداد بار قرض سے دبی ہوئیں۔ مکان اور زیور مہاجنوں اور ساہوکاروں کے یہاں رہن۔ اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ ہاتھ آیا بھی وہ ناچ گانوں رنگ کھیل تماشے، نیم ماہی نذر۔ نہ تعلیم و تربیت نہ اتحاد و تنظیم۔ نہ ہمت و خودداری، نہ جوش توحید، نہ ولولہ دینی، نہ قناعت و ایثار، عقیدے مشرکانہ، اخلاق جاہلانہ، عادتیں مسرفانہ، آپس میں حسد و بغض، ایک کی تاک میں ایک لگا ہوا۔ مجمعیت اور ہندویت کے حملے سیکڑوں سال سے جاری تھے، آخری زبردست ٹکر فرنگیت کی چٹان سے ہوئی۔

---

[1] لفظ "ہندوستان" کتاب میں جہاں جہاں آیا ہے اور قبل تقسیم کے ہندوستان بشمول پاکستان سے ہے۔

اور اس نے کہنا چاہئے کہ پرانے عربی جہاز کی چول چول ڈھیلی کر دی۔ اور مغرب کی
بس زیرک و زمانہ شناس اور اقبال مندی کے لحاظ سے پرشباب قوم انگریز
تیر و تبر توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ بے پناہ حربہ پروپگنڈہ کا استعمال
شروع کیا۔ اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں، کارندوں کو اسکول اور کالج
کے سانچے قالب میں بنا کھڑا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل پر برطانیہ کی عظمت، ہر زبان
پر اقبال سرکار کا کلمہ، داد خواہی کے لئے گھر سے نکلئے تو قانون انگریزی، کتابیں
انگریزی۔ عدالتیں انگریزی۔ لڑکوں کو پڑھانے بٹھائیے تو اسکول انگریزی۔ کالج
انگریزی۔ کتابیں انگریزی۔ زبان انگریزی۔ سفر کے لئے باہر نکلئے تو سڑکیں
انگریزی سواری (ریل) انگریزی۔ ٹکٹ انگریزی سفر کی منزلیں (اسٹیشن) انگریزی، دکھ
درد میں مبتلا ہو جیئے تو علاج کے لئے دوائیں انگریزی، حکیم انگریز کا، شفا خانے انگریزی۔ مرہم
پٹی انگریزی۔ خط بھیجئے، پارسل منگائیے تو ڈاک انگریزی۔ ڈاکخانہ انگریزی
روپیہ جمع کرنے ہی کا کھاتہ کھولنے کا شوق ہو تو بینک انگریزی۔ سیونگ بینک
انگریزی۔ ناول ڈرامے انگریزی، ورزشی کھیلوں کے لئے دل للچائے تو کھیل
انگریزی۔ فٹ بال، کرکٹ، ٹینس، اور [illegible]۔ شام کو سیر و تفریح کے لئے قدم
اٹھائیے تو سامان تفریح انگریزی، پارک میں، لان میں، کلب میں، ہوٹل و ریسٹورنٹ
میں رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر، کنسرٹ
اوپیرا، ماضی کو جاننا چاہئے تو تاریخیں انگریزی۔ حال سے باخبر رہئے تو
اخبارات انگریزی۔ تار یہ تباں انگریزی۔ پیشے انگریزی۔ بیرسٹری و وکالت

ہے۔ ایک بہت پرانا کھیل۔ اب مدت ہوئی متروک ہو گیا ہے۔ شروع انگریزی
راج میں اس کا بہت رواج تھا جن شہروں میں شروع انگریزی عہد کی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں
وہاں انہی کے نام سے عمارتیں ابھی موجود ہیں۔ میاں منیر شکوہ آبادی ایک پرانے اردو
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر)

ڈاکٹری۔ انجینیری۔ مطب ہے، انگریزی علم، انگریزی فنون انگریزی۔ صنائع
انگریزی۔ خلاصہ یہ کہ زمین انگریزی آسمان انگریزی۔
اپنی پستی اور صاحب کی بلندی۔ اپنی خاک نشینی اور صاحب کی فلک پیمائی
دیکھ، حواس بجا کس طرح رہ سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ اپنے دل و دماغ کا سرمایہ پہلے
ہی مٹ چکا ہے۔ ہوش گم، نگاہیں خیرہ۔ عقل دنگ، مرعوبیت غالب، دماغ
مفلوج، ڈوبنے کو گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آتا ہے۔ اندھیرے میں اپنے
ہی سایہ پر بھوت کا گمان گذرا، اشتباہ حواس میں دیو جن پری کا حسن و جمال
معلوم ہوا۔ دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔ اچھے اچھے ہوشمند اور
مخلص۔ سید احمد خان۔ اور ان کے سارے رفیق یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ
"چلو تم ادھر جدھر کی ہوا ہو جدھر کی"۔ سمجھا کہ بجز مذہب کے ہر چیز انگریزی کا
بن جاؤ۔ فلاح اور زندگی کا سہارا بس یہی میں۔ حالی بڑے خشوع و خضوع
سے مسدس اسلام کھول بیٹھے۔ لیکن مناجات کا خلاصہ بس یہی کہ اے پاک پروردگار
ہمکو عمل میں انگریزوں سا بنا دے اشبلی نے بڑے ٹھاٹھ سے مادران اسلام کا
دربار سجایا۔ لب لباب اس کا بھی یہی کہ ہمارے اکابر سلف دانایان فرنگ سے
کیا کچھ کم تھے۔ اور نذیر احمد، ذکا اللہ، محسن الملک، چراغ علی، بیچاروں کا
تو ذکر ہی نہیں۔ اب قوم تھی۔ اور اس کے سر پر جادوئے فرنگ! ہر طرف سحر
سامری کا دور دورہ، ہر سمت سے وبائی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا
کہ انگریزی بولنا آجائے۔ لب و لہجہ "صاحب" کا سا ہو جائے۔ ڈگریاں اور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱ سے آگے) شاعر ہوئے ہیں دیوان وہ بھی ایک جگہ باندھ گئے ہیں ؎
سوجھت جائے کا ایک پیڑ بونے باس — ہم تو انما اس قمر سے قیس دیکے کھیلتے ہیں۔

امتحانات سرکاری نصب میں آجائیں۔ اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے۔ اپنی زبان۔
اپنے علوم، اپنے یہاں کے کھانے پینے اپنے اپنے طرز کے پہنے اور رہنے۔ اپنی
معاشرت، اپنے خاندان، اپنی برادری، یہانتک کہ اپنے ماں باپ سے بھی شرم
آنے لگے۔ اپنے ہاں کی ایک ایک چیز میں ذلت وحقارت نظر آنے لگی۔ معزز
صرف "صاحب" اور "شیخ صاحب" ٹھہر جائیں۔ اپنے ہاں کی شرم وحیا حجاب و
نقاب، اس لئے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں دیکھتی جن وفرشتہ کا
شمار اس لئے اوہام میں اسپنسر ان کے قائل نہیں۔ عرش کا وجود اس لئے باطل کہ
جغرافیہ کی کتابوں میں اسکا ذکر نہیں۔ وحی، نبوت، توحید کے بنیادی مسائل
اس لئے فرسودہ اور متروک کہ پادری کا اپنی گڑھی ہوئی مسٹر کا نہ مسیحیت
میں ان پر وسائل عقلی قائم نہ کر سکے۔ داڑھی منڈانی اس لئے واجب "صاحب"
منڈاتے ہیں سود جیسی حرام کمائی جائز کہ صاحب کے دیش میں شہر شہر بینک
کھلے ہوئے ہیں۔ "سرا" ذلیل ہوٹل معزز، مختار کارندہ، "قصر ایجنٹ" "قابل
عزت اہلکلم، غریب کس مپرسی میں پڑے ہوئے۔ "ڈاکٹر" ہاتھوں ہاتھ لئے جارہے
ہیں۔ "گلی ڈنڈا" کے نام سے شرم کرکٹ باعث فخر۔ "بھانڈوں کا طائفہ"
پستی کا مثال۔ تھیٹریکل کمپنی اعزاز کا نشان۔

غرض عرش سے لیکر فرش تک ذرہ سے لیکر آفتاب تک،
علم وعمل، معاشرت اخلاق، عقائد کے دائرہ میں کوئی شے ایسی نہ تھی جو
"صاحب" کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو۔ اس فضا، اس مرعوبیت
سے معمور "دانش فرنگ" "حکمت مغرب" "عقلائے فرنگ" "اقبال سرکار"
"دانایان مغرب" وغیرہ خدا جانے کتنے عنوتے اور مرعوبیت کی یادگار۔
علوم متعارف کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے اور ہماری زبان

وادب کا گویا جز بن گئے۔ "فرنگی" کا لفظ اس قبل ہجو و ذم کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ اس "دور فرنگ" میں محل محل مدح و عظمت میں استعمال ہونے لگا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پا جاتے ہیں۔ تو بس یہی ہونے لگتا ہے۔ ہر چیز یہ انھیں کی عینک سے یہ خود بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے نہ اپنی نظر اور تاریخ والوں کا بیان ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آرہا ہے ؎

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل سے یوں ہی ہمیرے بار ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی فضا جس میں اکبر نے آنکھیں کھولیں۔ یہ تھا وہ ماحول جن کے اندر انھیں اپنا پیام پہونچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے۔ ہوتے تو پھر کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس طرح اور ان کے ہم عصر شاعر اچھے اچھے خوش فکر زینت مشاعرہ ہو رہے تھے۔ یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزلیں کہتے رہتے یا بے طرح بھی قافیہ پیمائی میں لگے رہتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے۔ ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے۔ اور ایک خاص مقصد حیات لیکر آئے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار ان کے شانہ پر تھا۔ یوں کہیئے کہ فطرت کی جانب سے ایک "رسول" بن کر آئے۔ "صاحب کتاب" حقیقی رسولوں کے جانشین اور ادنیٰ خادم۔ دل کڑا تھا۔ دماغ متاثر ہوا۔ آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل تھا ان کا پیام بھی اس تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا۔ ان کی شاعری اول سے آخر تک اسی مادیت فرنگ کا جواب ہے۔ اللہ کے کرشمے

کا ایک ایک تیر ہی نشانہ پر لگتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی ظرافت، ان کی سیاسیات کے دائرہ کی ایک معمولی سی بھی پیمائش ممکن نہیں تا وقتیکہ نظر اس مرکزی نقطۂ نظر پر نہ جمائی جائے۔ یہ رنگ موجود شروع سے ہی تھا۔ سن و تجربہ میں پختگی کے ساتھ نکھرتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا۔ عورتوں کی بے پردگی کے متعلق ان کا مشہور و معروف ضرب المثل قطعہ ان کے آخر زمانہ کا نہیں شروع ہی کا ہے۔ اور کلیات سوم میں نہیں کلیات اول میں درج ہے ؎

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیبیاں	اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا	کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

"عقل پر پردہ پڑ جانا"۔ اس محاورہ کا استعمال ایسی حسن و خوبی سے اس سے قبل کیوں ہوا ہوگا قوم کی انتشاری اور اضطراری حالت خود اپنی شامت اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس کا نقشہ بھی ان کے قلم کا کھینچا ہوا بہت حدت کا ہے ؎

مذہب کو نبا بحث میں تو سر ٹوٹا	چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر	اپنوں نے ہی ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت ہے۔ تزکیہ اخلاق ہے شعائر اسلامی کا احیا ہے۔ تہذیب اسلامی کی تجدید ہے۔ اور یہ وعظ سطر سطر میں موجود ہے۔ لیکن ہاں وہ حالی کی طرح خشک واعظ نہیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں پھر کچھ اور — پہلے ظریف ہیں پھر مصلح۔ پہلے نقاش فطرت ہیں پھر معلم اخلاق۔ ان کی مجلس میں شراب کے گلاس گردش میں رہتے ہیں۔ خوش رنگ، خوش مزہ۔ یحیٰی کے پیالے تقسیم نہیں ہوئے[1]۔ یہ اس رند پاک باز کی

---

[1] یہ تشبیہ حضرت اکبر کی سمجھائی ہوئی ہے۔ کہیں فرماگئے ہیں۔ افسوس ہے کہ کلیات میں کہیں وہ قطعہ نہ ملا (بقیہ دوسرے صفحہ پر)

کرامت ہے کہ حلق سے اترتے ہی وہ شراب خانہ خراب نہیں رہ جاتی شراب طہور ثابت ہوتی ہے لا فیہا غول ولا ھم عنہا ۔ اکبر سے قبل بنگال کے ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بھی مشن لیکر پیدا ہوا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا اور بنگالی زبان میں اس نے دلوں اور افسانوں کے ذریعہ اس سیلاب کے روکنے کی بھرکوشش کی تھی۔ اردو کا ایک ناول کا ترجمہ درگیش نندی وغیرہ کے نام سے آچکا ہے بنکم اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں کو رکھا تھا۔ اکبر نے اس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کا وار سب نے دیکھا۔ اکبر کا نشتر عموماً زیر آستینی رہا تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر "آزادی نسواں" ہے اس شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت، عریانی۔ بے پردگی بے حجابی، بے عصمتی کی ہے۔ اکبر کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے وہاں شوہر سے بھی محبت و غیرت سلب ہو جاتی ہے اکبر صاحب کے نگار خانہ میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ہے ۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں۔ اور شہادتوں سے جیسے جیسے حیا سوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے وہ وہاں کی زندگی کا جز بن چکے ہیں۔ اور "صاحب" کے قدموں کے طفیل میں ہندوستان بھی ان برکتوں میں مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں نہیں رہے ہیں۔ لیکن یہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵) کہ لوگ مجھ کو اور حالی ہی کو فرق دریافت کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ ...... "وہ یخنی میں ہیں شراب ا

ابھی احساس حمیت وغیرت بہر حال کچھ نہ کچھ زندہ ہے اس لئے واقعہ ہو چکنے کے بعد حسرتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اور ندامتیں بھی۔ سو یہ کیفیت اکبرؔ کی زبانی سنیئے ؎

کیا گذری جو اک ہرجے کے عدو رو رکے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی دولت بھی گئی، بیوی بھی گئی، زیور بھی گیا۔

اس غزل کے چند اور شعر بھی ہیں مدد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ کچھ ایسے بے محل اس موقع کے لئے نہیں ؎

اکبر نہ تھا بت خانہ میں زحمت بھی ہوئی زر بھی گیا
کچھ نام خدا سے انس بھی تھا۔ کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا۔

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹ خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشبو سے اس فقرہ پہ کل ہیں رو بابت
کوئی متنفس تھا نہ وہاں، اندر بھی پھرا باہر بھی گیا

آخری شعر میں شاعر جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اکبر مالی حیثیت سے ایک خاصہ بڑے آدمی تھے۔ سیشن ججی سے پنشن لی تھی۔ وطن الہ آباد میں عشرت منزل کے نام کوٹھی اپنے صاحبزادہ کے نام پر بنوائی۔ ایک زمانہ میں وہ واقعی عشرت منزل ہی تھی، دعوتیں، اسپیچیں شعر و سخن، چہل پہل، فرنیچر اور سامان آرائش سب ہی کچھ۔ آخر زمانہ میں حالت ٹھیک اس کے برعکس ہوگئی تھی۔ پہلی جہیتی بہو کملنے داغ

مفارقت دیا۔ پھر نوجوان محبوب بیٹا ہاشم رخصت ہوا۔ جج صاحب کی پنشن ہو چکی تھی۔ آنکھیں خراب ہو گئیں۔ عام صحت نے جواب دیا۔ بڑے صاحبزادے پردیش میں ملازم تھے۔ مکان سنسان۔ باغ ویران سامان آرائش غائب، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا۔ ہو کا عالم۔ ایک حضرت اکبر خود، ایک یا دو بڑھے ملازم۔ ایک بوڑھی ماما۔ بس کل اتنی ہی آبادی تھی۔

خیر یہ جملہ معترضہ آ گیا تھا۔ اب پھر پہلے سخن کیا گذری جو... وہ کود ہر اکر آگے چلئے۔ ایک جگہ بے پردگی تعلیم نسواں کو لازم ملزوم بتاتے ہیں۔ اور مختلف معنوں (پردہ اٹھنے، اور تعظیم کے لئے اٹھنے) کے لیے لفظ اٹھنے کے اشتراک سے پورا شاعرانہ فائدہ اٹھاتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کی
پردہ اٹھانا چاہتا ہے علم کی تعظیم کا

تخیل بے شک شاعرانہ لیکن اس واقفیت کو بھی اپنے دامن میں ہوئے کہ پردہ شکنی کی حمایت میں بڑی سے بڑی دلیل ہے۔ جی یہی کہ پردہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر علم کی تازی ہوا کا نصیب ہونا ممکن کہاں۔ علم و تعلیم کے جو معنے اس گروہ کے ذہن میں ہیں۔ ان کے لحاظ سے قول بیجا نہیں۔ ہمارے یہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا شروع سے دبی دبکی رہے۔ خانہ داری کے طور طریقے سیکھے کہ آگے چل کر آئے گو کر ملکہ بننا ہے۔ بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانہ جنت خیال کرے خانگی شیرازہ اس کی ذات سے بندھا ہوا رہے۔ خاندان کی مسرتیں اسی کے دم سے قائم رہیں۔ صحیح معنی میں "اہل خانہ" ثابت ہو۔ اولاد کو بہترین واسطہ پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزت، بچوں بڑوں کی تعظیم و خدمت

گذاری اور چھوٹوں کی الفت و شفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے۔ اور انھیں۔ جذبات سے بھرپور ہو کر دنیا سے رخصت ہو۔ فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار کچھ دوسرا ہے ان کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعث توہین ہے۔ موجب تحقیر ہے ان کے فرہنگ میں ادب و تعظیم اطاعت و خدمت گذاری، مرادف ہیں۔ محکومی اور غلامی کے۔ ان کا قول ہے کہ عورت اپنے کو چھپانے کے لئے نہیں دکھانے کے لئے آئی ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ جب دیکھئے گھر کے اندر شوہر کے پاس اس تنگ کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے۔ وہ عورت ہی کیا جس کے حسن گفتار حسن اقدار، حسن وصورت، زیب و زینت، خوش لباسی، کھلے بازی، رقاصی کے چرچے سوسائٹی میں عام نہ ہوں، اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں۔ زبانوں پر جب اس کا نام آئے تو لذت پیدا کر دے اس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کر دے۔ اور اس کا تصور دلوں میں شوق۔ بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو۔ بہترین ماں بلکہ وہ ہے جس کی ذات دوست احباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی دل و دماغ کے نقش ثبت ہوں۔ کلب کے درودیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر، اور ہوٹل کے کوچہ اور صوفوں پر ۔۔۔ "ہمارے" اور ان کے تخیل کے اس بعد المشرقین کو اقلیم لفظ و معنی کا تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور جس بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے۔ یہ اسی کا حصہ تھا ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی

اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

چمکی میں وہ بے پناہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ جائے

یہ چمک، مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ۔ برائے فانوسوں میں دیوسنا برائے چراغوں میں چمک دمک بھلا کہاں! شرم و حیا سے آزادی دنیا کی دلستانی کے لئے ناز و انداز غالبیت کے جوہر کی جدا، سب کچھ اس ننھے سے لفظ "چمکی" میں ظاہر و آشکار اور یہ شمع انجمن اور برائے خانہ کی کس قدر روشن، کیسی منہ بار ــــ! تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی۔ سچ کہا ہے بیسویں صدی کی کالج گرل کی قد آدم تصویر۔

حسن و ناز کی دنیا میں قابل داد اب تک کے سنجیدہ لوگوں، بے زبانی تھی۔ مشرقی شوہر مجازی دولہن، بیاہ کر اس لئے لاتا تھا کہ وہ اسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنا رہے اور تخیل "خانہ آبادی" کا غالب رہتا۔ اب جو جا کر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں۔ نقشہ بدلا ہوا ہے۔ ٹھاٹھ بزم آرائیوں کے جمے ہوئے حجاب کی جگہ بے حجابی، سکوت کی جگہ طوفان تکلم مستوری کی جگہ نمائش، عاشق بیچارہ اس کایا پلٹ پر دنگ، حیران، گوشہ کل تک جو نقش تصویر تھا وہ آج گراموفون کی طرح مسلسل وقف تکلم

لب چمنوں میں کھلی پا نا ہوں اپیچ کا شوق   خامشی سے نہ تعلق ہے نہ عکس کا ذوق
بت جو تھے دیر میں ناخوش ہوئے جاتے ہیں   شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ ہیں لطافت، بلاغت، اور جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ۔ تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے قدرتی نتیجہ ہے تغیر معمول کا جب فضا میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی ہے، راحت پر لذت مقدم ہو گئی۔ مردوں کا مطمع نظر بجائے تسکین قلب کے ہیجان نفسی قرار پایا تو قدرۃً عورتوں نے بھی انداز محبوبیت بدل ڈالے۔ مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی دوسرے ہو گئے۔

اکبرؔ ـ اسی موقع کا ایک اور منظر ہ

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت وہ لیتی ہیں اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزے میں کیسا مشرق و مغرب کے سمندر کو سمو دیا ہے۔ مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت تھا، وہ زچہ خانہ تھا۔ اور باورچی خانہ تھا۔ مغرب کے ہاں منتہائے نظر سادات، وہ نمائش ہے، بال روم اور کنسرٹ ہے۔ اور عورت غریب کرے بھی کیا۔ نظام تعلیم بنا بھی اسی ڈھنگ کا ہے۔ شروع سے ہی سکھایا ہی جاتا، دل میں بٹھایا ہی جاتا ہے۔ آج یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات و سائیکالوجی و حیاتیات بشری و ہومن بیالوجی کہہ رہے ہیں۔ اور لکھ رہے ہیں کہ دونوں صنفوں کے درمیان کشش جنسی ہے بالکل طبعی ہے۔ دونوں جب باہم ملیں گے اور کوئی مانع موجود ہو گا ہی نہیں تو رگڑ سے بجلی کا ایکبارگی پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ شریعت اسلامی نے اس گہری اور بنیادی حقیقت کے پیش نظر بدکاری کے نفس عمل ہی کو حرام نہیں قرار دیا بلکہ اس منزل تک پہونچنے کی جتنی راہیں ہیں ان پر بھی پہرے بٹھلائے ہیں۔ گویا دشمن کی بڑی ناکہ بندی۔ نہ بانس ہی نہ ملے گا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔ بیگانہ عورت و مرد کے اختلاط کو جب موقع ہی نہ ملیں گے تو پینگ بڑھنے ہی کیسے پائیں گے۔ بالکل بچپن کو چھوڑ کر باقی آگے بڑھ کر مشترک پڑھنا لکھنا ممنوع۔ مشترک کھیل کود ناجائز۔ بلا ضرورت یکجائی پر حکم انتہائی تاک جھانک حرام تاکہ سوسائٹی میں مفاسد کا زہر سرے سے پھیلنے ہی نہ پائے معاشرت ہمیشہ بے داغ رہے۔ تعلیم جب بدلنے اور تہذیب جب بدلے ان میں

سے ایک ایک منہ توڑا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ آزاد بال بڑھیں۔ بے حجابیاں آئیں۔ بے حجابیاں دلیل ترقی نہیں۔ جو باتیں کل تک انہونی تھیں آج گذر کر رہیں۔ بھولے بھالے لوگوں نے کہا اگر "محافظ عصمت" خود یہ تعلیم ہوگی یہ سبحان اللہ! فرنگی کا نام اگر کا فعرر رکھ دیا گیا۔ تو گویا چہرہ کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی۔ توقع لیڈروں سے بہرہ داروں کا کام کے کام کی جانے لگی۔ اب جبر مندلیس بھی کوئی کہاں تک گنا سکتا ہے۔ کہیں اکبر کے زمانہ بھی فرانس کی میڈم ڈی اسٹیل اور انگلستان کی جارج ایلیٹ کی سی ہستیاں خالی خالی نہ تھیں۔ اکبر کے توسط سے ایک مختصر مکالمہ ایک صاحب اور ایک صاحبہ کے درمیان سنیئے ؎

قلمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لپٹ جا	میں بھی گر بجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ
ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگمان	دونوں نے پاس کر لئے ہیں سخت امتحان
لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا	بولی یہ سچ ہے علم بڑھا جہل گھٹ گیا

یہ سب سچ لیکن پھر بھی یہ کہتے اور سوچتے ہیں کہ حیا و حجاب کے قیود و احکام تو مسلمان عورت کے لئے ہیں۔ جب دین سرے ہی سے غائب ہو گیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بندی سے آخر کیا حاصل؟ پردہ تو بقائے ناموس کے لئے ہے۔ جب ناموس ہی نہیں تو اس کی بقا کیسی؟ کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کے لئے ہے لیکن جب زندگی ہی رخصت ہو چکی تو مردے کو کوئی نہیں کھلانا پلاتا۔ صندوق میں اس وقت تک قفل پڑے رہتے ہیں جب تک قیمتی مال محفوظ ہے۔ لیکن جب صندوق خالی ہو گیا تو اس کی حفاظت ایک دردسر ہے۔ پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے جب تک وہ تازہ و شاداب ہیں باسی مرجھائے ہوئے پھولوں کو گلے کا ہار کوئی کیوں پسند کرے۔

(۵۷۔ اس صفحے کا حاشیہ صـ۱۱۳ پر ملاحظہ ہو)

فرماتے ہیں ؎

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید ۔ بے حجابی جو ہوا اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ ۔ شمع فانوس کو حاجت فانوس کیا ہے

چوتھے مصرع کی تشبیہ اکبر ہی کا حصہ ہے۔

خاتونِ مشرق کو مغربی میم بنا دینے کا ار... نتیجہ کیا نکلا ہے! خود مرد دں ہی نے شیکسپیر اور ملٹن کی ورق گردانی اور مل اور اسپنسر پر دماغ سوزی کر کے ابتک دنیا بلکہ ہندوستان کی محدود دنیا میں کون سے امتیازات حاصل کر لئے ہیں؟ شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار۔

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار
کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

خیر یہاں ذکر مردوں کی نہیں عورتوں کی تعلیم کا ہے۔ مرد جس طرح بڑھ بڑھ کر "صاحب" کے بیرے بنتے گئے، "صاحبیت میں ضم ہوتے گئے" اُنکے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ اسی طرح عورتیں بھی بڑھ بڑھ کر "میم صاحبیت" میں گم ہوتی گئیں۔ ہاتھ سے نکلتی گئیں۔ کلیات اول میں ان کا قدیم ترین کلام ہے۔ اس حقیقت کو اس دور کے ظرافت کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں۔

ترقی کی نئی ہیں ہم پر جو جڑھا کیں ۔ گھٹا کی دوست ایمن پڑھا کیں

(لہ بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) فرانس کی مشہور ادیبہ اخلاق و عصمت کے قانون سے آزاد

لہ انگلستان کی مشہور ناول نویس روزانہ نام لکھنے والی خاتون ایک اہل قلم مد جارج ہنری لیوس کے ساتھ مدتوں بے نکاحی بیوی کی طرح زندگی بسر کی۔

رہیں ہر پھر کے آپا ہی نصیبن ۔۔۔ وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

کلیات سوم میں اس مرقع آب و رنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں ؎

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا ۔۔۔ اک بیبی نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے ہال میں رقصاں ۔۔۔ باقی جو تھے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا
پیرزادہ بنا کیمپ میں یہ بن گیلی آیا ۔۔۔ بی بی نہ رہیں جب تو میاں بن بھی سدھارا
دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ ۔۔۔ آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا

خیال نہ گذرے کہ اکبر مرحوم تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ اور لڑکیوں کے بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی و ہمدرد اپنی جگہ پر تھے۔ لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تائید میں اس تعلیم کے تھے جو قوم نمونہ رابعہ بصری کے نہ سہی دور مغلیہ کی جہاں آرا بیگم پیدا کرے۔ نہ اس تعلیم کے جو زینت ہو ہر ہاؤس کی، ہر پکچر پیلس کی۔ اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں خدا کا قہر سمجھتے تھے۔ جس پر بنیاد دین تعمیر ہوتے ہالی ووڈ[1] کی۔ وہ آرزومند تھے اس نظام تعلیم کے جو مہربان مائیں وفا شعار ہو۔ ہاں اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے نہ اس کے جو تھیٹری، ایکٹری اور برہنہ رقاصی[2] کے کمالات کی جانب لے جائے۔ وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا

---

[1] (HallyWooD) امریکہ کا مشہور شہر فلمی دنیا کا کہنا چاہیے۔ دارالسلطنت ہزارہا آبادی روزانہ فلمسازی کی مختلف شاخوں میں سرگرم

[2] ۔ سنہ ۱۹۱۳ء کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک برطانوی مس صاحبہ اڈ ماڈ ایلن MANDALLEN نامی مشہور آرٹسٹ ہندوستان تشریف لائیں بڑی دھوم دھام کے ساتھ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵ پر)

چاہتے تھے کہ دنیا نمونہ جنت بن جائے۔ وہ یورپ کے مشتاق نہ تھے۔ کہ ملک راجہ اندر کا اکھاڑہ ہو کر رہ جائے۔ ان کا قول تھا ؎

دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مزید توضیح سنیئے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد ایسے ہوں مگر ایسے استاد جی نہ ہوں

"استاد جی" محاورہ لکھنؤ میں ارباب نشاط کے "تعلیم" دینے والے کو کہتے ہیں۔ ذو لفظ تعلیم" لکھنؤ کی زبان میں ایک خاص معنی میں مستعمل ہے۔ ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۴ سے آگے) انگریزی اخبارات روزانہ ان کے تذکروں اور کارناموں سے بھرے رہتے تھے۔ اپکا آرٹ ناچ تھا۔ ایک خاص ناچ کے وقت جسم پر ہلکا سا لباس جھل جھل کرتا ہوا غالباً موتیوں کی لڑیوں کا رہتا تھا۔ یہ نیم برہنگی تو خیر شروع ہی سے رہتی تھی۔ رقص جب شباب پر پہونچتا تو گردش اس تیزی کی ہوتی کہ گویا جسم نہیں کوئی مشین ہے۔ جس میں کمانی لگی ہوئی ہے لباس کی لڑیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اڑنے لگتیں یہاں تک کہ جسم پر ایک تار بھی باقی نہ رہ جاتا اور مس صاحبہ برہنہ مادر زاد ہو جاتیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ گردش رقص اس مسلسل تیزی کے ساتھ ہوتی کہ دیکھنے والے کی نظر کا جمنا ناممکن تھا۔ اور یہی اس آرٹ کا کمال تھا۔ حضرت اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے تحریر فرمایا کہ مس ماڈ ایلن آئی ہوئی ہیں۔ سنا ہے کہ برہنہ ہو کر اس طرح ناچتی ہیں کہ شائقین کو سائنس کا وجد آجاتا ہے۔ یہ ذکر دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہے۔ اس وقت تک کمالات بیشتر یورپ ہی تک محدود تھے اور اب۔ حدیث نبوی جو انکا ریات العادیات آہلے (بقیہ حاشیہ ۱۱۵ پر)

چند شعروں سے اندازہ کیجئے ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہے وہ بے شعور ہے
ایسی معاشرت میں سراسر فتور ہے — اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت — جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت — ہر وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ — شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
عصیان سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے — اور حسن عبادت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت و خواند اصول و حفظ صحت کھانا پکانے کپڑے سینے وغیرہ کو درس نسوانی کا لازمی نصاب بنا کر فرماتے ہیں اور یہاں خیال میں رہے کہ نظم کی تحریک اور مخاطب ایک غیر مسلم خاتون تھیں ؎

دانائے دہر دیا ہے تو دل سے غنی رہو — پڑھ لکھ کے اپنے گھر میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے — مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے — ان کی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے
اکبر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے — دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا ہے تو اس کا عمل خراب — آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

عجیب دقیانوسی خیال کے تھے۔ آخر تک "آج" اور "کل" کے چکر میں پڑے رہے۔ "آج" تو خیر آج ہی ہے پر "کل" آخر کیا بلا ہے؟ خواہ مخواہ ہر عیش کو منغص کر دینے والا۔ فرماتے سب کچھ تھے لیکن ساتھ یہ بھی جانے ہوئے سمجھے ہوئے تھے کہ رفتار زمانہ کا رخ پھرنا کسی انسان کے بس کی

(بقیہ سلسلہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵ سے آگے) کہ بعض عورتیں لباس پوش مگر برہنہ، اس کی تفسیر اس دور سے قبل کیونکر کسی کے سمجھ میں آسکتی تھی!۔

بات نہیں ا۔ انبیا تک کو یہ قدرت نہیں۔ مشیت تکوینی ہر صورت میں
اپنا چکر اپنا دورہ پورا کر کے رہتی ہے۔ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی نصیحت کس نے سنی
یحییٰ و عیسیٰؑ پر کتنے ایمان لائے۔ یونسؑ و لوطؑ کی تصدیق کتنوں نے کی؟
بے چارے ہر دور میں طعنے سنا کئے ساحر ہوئے شاعر ہوئے مجنوں ہوئے
آج کی اصطلاح میں (VISONAR) یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد ہی عذاب
الٰہی کے زلزلے نے یک بیک دھڑ پکڑا اور مایہ ناز نظام تہذیب و تمدن
کی بنیادیں تک ہلا ڈالیں۔ زار روس کی جابرت شہنشاہیت کی مطلقہ
کا چشم زدن میں ملیا میٹ کر رہنا۔ اس غیبی گرفت کی جیتی جاگتی مثال ہے اور پھر اس سے
بڑھ چڑھ کر یورپ کی پہلی مہابھارت اور دوسری مہابھارت ان سطروں کی تحریر
کے وقت نا تمام و غیر مختتم [2]

حضرت اکبر بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس ہوگئے تھے۔ اور بار بار اس
کا اظہار کیا۔ کلیات دوم کے ایک قطعہ میں آزادی نسواں کے مستقبل کا رقعہ کھینچے
ہیں۔ حسب معمول دلکش فرماتے ہیں کہ ضبط نفس اور تقوی اور ایمان رکھنے
والے تو گذر گئے کہ اب دور دورہ ہے صاحب کے قائم کئے ہوئے کالج کے نوجوانوں
کا ہے

گئے وہ جنہیں غرور تھا خودداری کا — نہ وہ تقوی نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی امید
ولولے پیکے نکلنے لگے کالج سے جوان — شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈ ان کی مسجد، تھیٹر ان کی عید گاہ۔ اس تمدن کے
لازمی نتیجہ کے طور پر ہے

---

[1] ۱۹۱۷ء [2] زمانہ تحریر ۱۹۴۵ء

بحث میں آہی گیا فلسفہ شرم و حجاب

دور گردوں کی کہانتک کوئی کرتا تردید

عورتوں کو "حقوق نیا سی حقوق مل گئے" "مطالبات منظور ہوگئے"

کام وہ مردوں کے دوش بدوش کرنے لگیں ؎

زہرہ ممبر ہوئیں ورکنگ جناب خورشید

کچھ پرانے بڈھے کھڈھے تھے۔ ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے۔ بولے

کہ گل کھلانے کے لئے صاحبزادے کچھ کم تھے۔ جواب صاحبزادیوں کو بھی اس

میدان میں لایا جارہا ہے ؎

شیخ صاحب ہی کلے بزم میں کیا رعب و وقار

کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

روشن خیال دنیا کی لعنتوں متحدہ دنیا کی ملامتوں کی

بجلیاں ان دقیانوسیوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ؎

نعرہ تحقیر کے اس طرح ہوئے ہار داس بلند

اور تو اور گھرانوں کی کنواریاں، المومنات الغافلات نہیں

شوخ و بیباک کھیل کھائی ہوئی ؎

لڑکیاں بول اٹھیں خوبہ طریق تائید

دولہا بھائی کی یہ رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ ہوا کہ بیت الغزل سارے قطعہ کی جان ؎

خود تو کٹ پٹ کے لئے جان دئے دیتے ہیں

ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

شیخ بیچارہ اس کی تاب کہاں سے لاتا، بھاگ کر حجرہ میں بنا ہلا

کنڈی اندر سے چڑھا لی ؎

اکبر افسردہ شد از گرئ ابن طرزِ سخن ؎ شیخ بگریخت در صومعۂ خویش خزید

تجدد کی جے تالیوں کی گونج میں پکاری گئی۔ اور آدم کے بیٹوں

اور حوّا کی بیٹیوں دونوں نے مل کر حصولِ آزادی کی مبارک باد سنائی ؎

کھل گیا در نہ رہا شاید مشرق کو حجاب غل مچا تہرے کا بول اٹھے یہ مغرب کے مرید

للہ الحمد ہر آن چیز خاطر می خواست آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

ایک پرانی غزل میں بھی مضمون اسی آزادئ نسواں کا

آگیا ؎

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کب تک

جو منہ دکھانے کی ہے رسم پیروِ ابلیس تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیبیاں بیٹیاں کب تک

مقطع انجام کی پیشین گوئی ہے ؎

سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامیِ پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

اسلامی نظام تہذیب کے جوہر لطیف ہی عصمت و عفت شرم و

حیا کے جذبات میں اور فرنگیت کی زد بھی سب سے پہلے اخلاق کے انہی

ستونوں پر پڑتی ہے۔ اس لئے قدرۃً اکبر نے بھی طبع آزمائی اس موضوع

پر بہت زائد کی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ مغربیت فرنگیت کے جو عیاں

مظاہر ہیں انھوں نے تقریباً ان سب ہی پر کم و بیش توجہ کی ہے۔ عبرت

پذیری ان کے قلب کا اور عبرت آموزی ان کے قلم کا جوہر ہے اس

ایک قوت کے سہارے ہر چند زمین میں نئے نئے شگوفے کھلاتے ہیں۔

اور ریگستان کو لالہ زار بنائے چلے جاتے ہیں۔ کمیٹی سازی اور جلسہ بازی

کے مشغلوں میں پڑ کر دین کی طلب اور روح کے تعلق کا ضعف کا
عکس ذرا اکبرؔ کے جام جم میں ملاحظہ ہوے

نفس کو تو اکیفیں با تو لوسے مزہ آتا ہے — جہاں ہر گام پر اک دام بلا ہے درپیش
سمبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکر خدا آتا ہے — اس کیفیں کو نہیں روح کی لذت کا خیال

خالص دوستی، بے غرضانہ محبت کے لفظ سیاسیات حال کے لغت سے بے معنی ہیں۔ ہندوار گر اتحاد کا ہاتھ مسلمان کی طرف بڑھ رہا ہے تو صرف اس لیے کہ دونوں مل کر انگریز کا مقابلہ کریں۔ انگلستان اگر اگر روس سے لگاوٹ کرتا ہے تو محض اس غرض سے کہ جرمنی سے لڑنے کے لیے ایک زبردست حلیف ہاتھ آجائے۔ خود مطلبی کا نام مہذب بولی کی اصطلاح میں ڈپلومیسی ہے۔ دل سے نہ یہ ان کا شریک نہ وہ ان کا۔ دلوں میں زہر کے انگارے بھرے ہیں۔ بو لیوں پر میٹھے بول۔ اسلام کے شاعر کو عبرت کا یہ منظر دیکھ کر اپنے یہاں کا بھولا ہوا اور بھلا یا ہوا سبق الحب للہ والبغض للہ کا یاد آجاتا ہے۔ اور اس کے منہ سے نالہ سوزدل نکلتا ہے ؎

جس کا تو حامد ہے اس کا جو ہو حاسد تو یار — اب تو ہماری کارسی پر رہ گیا ہے انحصار
اب تو ہر اک ہے جدا وراک جدا درگاہ کا — جنگ جتنا تھی بتوں سے نام تعالیٰ اللہ کا
واسطے اللہ کے ہو اب دوستی کہاں

چندروزہ متفق ہوں ور نہ یہ شیخ و ہنود — ہاں تجارت اور پالٹیکس میں دیکھیں جو سود
واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

۱۹۱۸ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخباری میدانوں میں بحث طریقت وشریعت کے درمیان چھڑ گئی۔ شریعت کا جھنڈا لاہور کے دفتر زمیندار سے بلند ہوا۔ طریقت والوں نے جوار دہلی کی ایک درگاہ میں پناہ

لے کر ضربیں لگانا شروع کیں۔ اور جب دیکھا کہ حریف کی گستاخیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں تو جھٹ حکومت سے فریاد نقض امن عام کے نام پر کر دی۔ اکبر نے عین اس وقت جبکہ اشتعال جذبات کا شباب تھا۔ مصلحت شناس وہ مصلحت جوئی کے چھینٹے ڈالنے شروع کیے۔ آگ اپنے وقت پر بہرحال بجھتی ہے اور مدت ہوئی کہ اب اس کی خاکستر بھی باقی نہیں۔ البتہ اکبر کے چشمۂ اصلاح کے وہ قطرہ یادگار رہ گئے جو کبھی انشاءاللہ خشک نہ ہوں گے۔ پوری نظم ذرا طویل ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو ؎

اس وقت مولویت صوفیت سے بھڑ گئی ہے — اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
ملا کو زعم ہے یہ دائم چرا نہ گویم — صوفی کو یہ غم دارم پائے چرا نہ پویم
ملا یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآں ہی سے رٹئے — صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے
کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن — دیکھا نہیں تھا لیکن مردوں پر آپریشن
اس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں — آپس کی گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
شیعہ ہوں خواہ سنی، ملا ہوں خواہ صوفی — بے سود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی
دیکھو ذرا تنزل خود ہی زور پر ہے — موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے
وقت نزاع باہم ہرگز نہیں یارو — اللہ کو پکارو اللہ کو پکارو

سب سے گہرا داغ لفظ ترقی کا ہے اگر ہم عیب کو عیب ہی سمجھ لیں۔ جب ہی کوئی صورت تو اس سے بچنے کی بھی نکالیں۔ سوچیں، لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ مصائب کو مناقب، نقائص کو کمالات سمجھ رہے ہیں۔ اور زہر کو تریاق کے درجہ میں رکھ رہے ہیں۔ "ترقی"، "تہذیب"، "شائستگی"، "ارتقاء"، "روشن خیالی"، وغیرہ وغیرہ الفاظ کان میں پڑ گئے ہیں۔ الٹ پلٹ کر یہی ہماری زبان پر آرہے ہیں۔ یہی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ شوق

انہی مقصدوں کی تکمیل کا۔ داد دیجئے فرشتوں کے روایتی علم کی ذہانت کی شکار کو پھانسنے کے لئے کیا افسوں کان میں پھونک گیا ہے ؎

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی

اب لوگوں کو سم شوق ترقی کا دلادو

شکاریوں کا بیان ہے کہ جب جب شیر کا شکار منظور ہوتا ہے تو درختوں میں بھینسے باندھ دئے جاتے ہیں شیر ان کی خوشبو پا کر انہیں نوش جان کرنے جلد جلدی لپکتا ہوا چھپٹتا ہوا آتا ہے اور شکار کرنے کے عوض خود ہی شکار ہو جاتا ہے شاعر اس کی تشبیہ کو بھی اپنے کام میں لاتا ہے ؎

شیران مشرق کا انہیں منظور ہے شکار

بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

ہم حقوق سیاسی توسیع پر مسرور نہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اب ہمارے نمائندے اتنو کے بجائے اتنے ہو گئے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرز انتخاب نے خود ہماری جماعت کے اندر کیسی پھوٹ پیدا کر دی ہے۔ باہمی رشک و حسد، بدگمانیاں، و نفسانیت خود غرضی، نااتفاقی میں کتنی ترقی دے دی ہے۔ اور طرح طرح کے ناجائز لالچوں ترغیبوں کا دامن ہمارے نفس کے لئے کتنا وسیع کر دیا ہے عذاب عقبیٰ کو چھوڑیے۔ عذاب دنیاوی اپنے ہاتھوں مول لیا ہوا کچھ کم ہے ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے

خدا کی مار سے دونوں کی مار کیا کم ہے

یہی راگ اکبر دوسرے دھن میں سنئے ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا | اچھے اچھے ووٹ کے شیدا

کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — سمجھیں اس کو فرض کفایہ

بھائی بھائی ہیں یا بھائی پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی

یاددں کا ہوش نہ اب فکر سر[۱] کی — ووٹ کے دھن میں بن گئے پھرکی

اس جدید نظام اخلاق کو تعلق والدین کی خدمت و تعظیم سے نہ بزرگوں کی بزرگ داشت سے نہ اللہ اور رسولؐ کے احکام حقوق سے۔ فضا ایسی تیار ہو گئی ہے کہ ماحول ہی ایسا بن گیا ہے ؎

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنو گئے تعلیم دی سرکار نے

یہ شاعری، شاعری نہیں حقیقت کا ترجمانی ہے ؎

آخرت کا خیال جانے دیجئے۔ یہ ارشاد ہو کہ تہذیب جدید نے اس دنیا کی زیست کی سہولتیں کہاں تک پیدا کیں؟ جینا آسان کر دیا ہے۔ یا اور مشکل؟ جنگ، ہلاکت، غارتگری، سفاکی کے وہ حیرت انگیز آلات و وسائل جو چنگیز و ہلاکو وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ کس نے ایجاد کئے ہوئے ہیں؟ موٹر، موٹر سائیکل، ریل، لاری، ٹریم کے روزانہ ناگہانی حادثوں نے ہر بڑے متمدن شہر میں موت و ہلاکت کا اوسط کچھ گھٹا دیا ہے یا اور بڑھا دیا ہے؟ روزمرہ کی ضروریات زندگی کی اس کمیابی (اور اب تو نوبت نایابی تک پہنچ چلی ہے) کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملے گی؟ ملوں کی بھرمار، چمنیوں کی افراط، انجنوں کی ریل پیل، مل کے مزدوروں کی

۱۔ سر کا تلفظ لکھنؤ اور دلی کی بول چال میں "سِر" (بالکسر) ہے نہ کہ سَر (بالفتح)

آبادی کی گنجانی، ہر وقت کی گھڑ گھڑاہٹ، ہر گھڑی کے شور و ہنگامہ، دم بدم کے دھولی نے بڑے بڑے متحدہ شہروں کی صحت کا کیا حال کر دیا ہے بڑے شہروں کے شہریوں میں فیصدی کتنوں کے دانت درست ہیں؟ معدے ٹھیک ہیں؟ آنکھیں عینک سے بے نیاز ہیں۔ جو سکون قلب آسائش و راحت و تمدن بیگانہ دیہاتیوں کو حاصل ہے اس کا کوئی حصہ تمدن جدید کے پر آشوب ہنگامہ اور ہیجان آفریں مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس قسم کے سوالات کا حل اکبر کی ترجمان حقیقت زبان یوں پیش کرتی ہے ؎

تہذیب تو جیسے تم کہتے ہو اس سے اکبر — دنیا بگڑ رہی ہے اب باسلو ر ہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو — کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج و تردد — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

سنتے آئے ہیں کہ ہر درد کی دوا علم ہے خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے۔ محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے۔ کہیں اور کبھی بیشک ہوتا ہو گا لیکن اپنے نصیب کو کیا کہئے کہ روئے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے۔ ہمیں سابقہ اس جس علم سے اس دور میں پڑا ہے [illegible] تو اسراض کا مورث ہے۔ مفاسد کی اصل ہر مصیبتوں کا منبع جسے شربت کا نام دیا گیا ہے وہی جام زہر نکلا۔ جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا وہ رہزن ثابت ہوا جس نظام کو ہم نے "علم و تعلیم" کا نام دے رکھا ہے وہی تو عین جہالت ہے۔ یہ تو وہی علم ہے جس کا مقصود دلوں میں حب دنیا کو اور پختہ و راسخ کرنا ہے۔ خیال عقبیٰ و آخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں نصابی تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسول کے اعتقاد سے ناآشنا اس کا سایہ نہیں

سطحِ مادیت کے اوپر کچھ دیکھنے سے اندھا اس حکمت میں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود عنقا۔ اس پڑھائی لکھائی کے جو نتیجہ نکلتے تھے نکل کر رہے ان پر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کیے جانا تو گویا یہ چاہتا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے۔ لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو۔ پانی کا وجود ہو لیکن کسی شے کو تر نہ کر سکے۔ آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے منور نہ ہو پائے۔ اکبر کی تشخیص میں یہی نظام تعلیم تو ہے جس نے ابتری ہمارے اخلاق میں۔ معاشرت میں۔ مذہب میں پیدا کر دی ہے۔ ؎

ایک علم تو ہے بت بننے کا ایک علم ہے حق پر مٹنے کا
اسی علم کی سب دیتے ہیں سند اس علم میں ماہر کون کرے
جب علم ہی عاشق دنیا ہو پھر کون بتلائے راہ خدا
جب خضر اقامت ور ہوں فدا تا ابد مسافر کون کرے
سودا ابھی ہے رنگ طبع بستر فطرت ہی میں ہیں اسباب جنوں
اکبر کو بھی ہوش آ جائے تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

اسی حقیقت کی ترجمانی ایک دوسرے وزن اور قافیہ میں ؎

مسٹر نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی — شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس — چارہ کیا تھا ایسے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

یہی مضمون ایک تیسری جگہ ؎

اس چیز کا کیا کہنا اکبر جس نے دل کو نیک کیا — لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا ہموار کیا اور ایک کیا
جو قوم کو ابتر کرتے ہیں اب انکا اثر پر رونا ہے — معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے
اس کا جو سبب ہے سن لو سب کہ وہ بیان ہے ظاہر ہے — الفاظ صریح و واضح ہیں یہ مطلع اکبر جافہ ہے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

فرماتے ہیں ملت کی شہزادہ بندی اگر مقصود ہے تو علی گڈھ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ ملازمت اور چاکری کے سکوری کی ٹکسال کا کام تو یہ غوس کالج ضرور دے سکتے ہیں لیکن قوم کا قوام تو ان رہبری سے نہیں عربی ہی سے درست ہو سکتا ہے۔ خشک حقیقت کو ظرافت کے چٹخارے کے ساتھ یوں بیبتی کرتے ہیں ؎

عربی ہی نظم ملت بی اے ہیں حرف روئی	یہ بات تو کھری کہ ہے ہرگز نہیں کھوئی
بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی	لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے
کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی	اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے

لیکن نظم ملت و اصلاح امت کی اب پروا ہی کس کو ہے۔ دین کا اب سوال ہی کیا ہے پیش نظر تو صرف دنیا اور اس کی ترقیاں اور اسمبلی اور کالج، جاہ اور منصب مشاہرہ اعزازی، خودی کی پرستش ہے اب فرصت کس کو ہو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر یہ منظر دیکھ کر یہ صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا کر یہ قول غلط ہے تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظام کائنات میں اذیت و تکلیف کا وجود رکھا ہے اس غرض سے گیا ہے کہ اس سے نفس میں شکستگی و تضرع پیدا ہو۔ ذہن بجائے اسباب کے مسبب الاسباب کی جانب متوجہ ہو۔ مخلوط اپنے ہم جنبوں سے بے مس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے، چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں ان کا فلسفہ یہی ہے فطرت سلیم ایسے موقعوں پر راہ ہدایت پا جاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہے۔ اس کی شقاوت، قساوت کے لئے یہ تمام تازیانے بے اثر رہتے

ہیں - ہر پارہ نشان عیبی - ہر جدید آیات الہی ؟ ہر تنبیہ فطرت، غفلت
وجود، الحاد دامراض میں اضافہ کرتی ہیں جو تریاق ہونا چاہیے تھا وہ
اس کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے - ہجوم مصائب میں بھی اسے تکیہ
مادہ اسباب پر اور بھروسہ دنیوی مسائل پر رہتا ہے - دست سوال
ہر بڑی کوٹھی کے مکین پر اونچے دفتر کے سر - دفتر کے آگے دراز ہوتا رہتا
ہے - پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کراتا رہتا ہے - ہر امیر ہر
وزیر ہر بڑا افسر امیدوں کا مرکز حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے امید سے
بے تعلق مصیبتوں کے ہجوم بے وقت بجائے گھٹنے کے اور بڑھ جاتی ہے اگر اپنے
گرد و پیش یہ منظر دیکھ اس زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے
ہیں - لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یاران مجلس کو درد عبرت کے تذکروں
سے کیا واسطہ - یہ تو اس کے نام سے وحشت کرتے ہیں - بزم میں قدم اس
شان سے رکھتے ہیں کہ چہرے پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے نشاط، زندہ
دلی کا ساز ہمراہ ہے لیکن منہ سے صدائیں درد عبرت کی نکل رہی ہیں -
اور زیر لب آواز سوز و فغاں کی آ رہی ہے بزم میں تماشائی زیادہ
ہیں - اہل نظر کم - تماشائی یہ سو رنگ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں اور اہل
نظر آنکھوں ہی سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں - ایک جھلک دیکھتے چلیے -

ترقی کی راہیں جو زیر آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ان کو — دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

فضا کی حالت یہ ہے کہ سچی بات زبان سے نکالنا مشکل بس جو کچھ
سب کہہ رہے ہیں وہی کہے جائیے - جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں وہی کیے
جائیے - جس حمام میں سبھی ننگے ہوں اس میں آپ بھی بلا تامل بے پردہ ہو جائیے

جب تو آپ اچھے ۔ آپ کی باتیں اچھی ۔ آپ کی سوسائٹی اچھی، ادھر کلمہ حق زبان سے نکالا کہ مارے گئے ۔ ہر طرف سے آوازیں کسے گئے ۔ لتاڑے گئے ۔ اعزاز و عافیت کی تلاش ہے تو جو رنگ چھایا ہوا ہے بس اسی میں چپکے سے خود بھی رنگ جائیے ؂

یہ عجب عمل یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش ابھر گئے
جو بچے نہ بدعت تو بچے ذرا جو کھری کہی تو دھر لئے
تری بزم اگر خوش یہاں ہے محل فرحت دوستاں
جو ملول آئے وہ خوش گئے جو افسردہ آئے بہل گئے

مذہب و اخلاق خدا اور رسول حشر ملائکہ کو چھوڑئیے ۔ اس وقت ڈگری حاصل کرنے گریجویٹ ہونے ، ڈاکٹریٹ کی سند پا جانے کونسل کی ممبری ایک اے ملازمت میں داخل ہو جانے کی دھن میں اتنے حواس بھی کسی کے نہیں کہ خشک عقلی و علمی بحثوں پر قوت غور و خوض صرف کی جائے اور اتنی فرصت کہاں کہ دراز سی نہ سہی مختصر سی وطوسی ہی کے لئے وقت نکالا جائے ۔ معیار تو یہ صرف ٹھہر گیا ہے ۔ کہ فلاں مطالعہ طلب ذریعہ حصول جاہ میں کہاں تک معین ہو گا ۔ اور یہی لمبی کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں سن لیجئے ؂

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض — سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا
بہر خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع — صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

لڑائیاں حکومتوں کے درمیان پہلے بھی ہوتی تھیں ۔ البتہ پہلے ان کی بنیاد تحفظ عقائد ، پاس عزت حفظ ناموس تھی ، غرض کوئی نہ کوئی پہلو خودداری کا لئے ہوئے ہوئے ۔ اب دنیا اس درجہ غالب آ گئی ہے کہ سب لڑائیاں اکر

جنگ کی محرک تقریباً ہر جگہ تجارتی رقابت رہ گئی ہے۔ اور معاشی سبقت۔ فرماتے ہیں: ؎

مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے ہے اب تو جنگ حکم تجارت کے واسطے
لے ہی گئی گھسیٹ کے مجھ کو پر پڈ بیر تیار ہو رہا تھا میں جنت کے واسطے

کسی زمانہ میں ہمیں تعلیم یہ ملی تھی کہ راہ خدا میں جو کچھ کرو حتی الامکان خلق کی نظر میں پوشیدہ کرکے۔ اور جو کچھ بھی خیرات کرو اسی کے مقصود۔ اللہ کی رضا جوئی نہ کہ بندے پر کوئی احسان لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہے اور اعلان پہلے کیا جاتا ہے۔ جلسوں میں بھی تالیوں کی گونج کے درمیان اور پھر اخبارات کے ذریعہ بھی۔ بلکہ بہت سی صورتوں پر بس اعلان ہی اعلان۔ وعدہ ہی وعدہ رہتا ہے۔ اس سے آگے نوبت بھی نہیں آتی اور پھر اس کار خیر سے مقصود کیا ہوتا ہے۔ عموماً یہی نہ کہ فلاں انجمن کی صدارت مدرسہ کی سرپرستی ہاتھ آجائے۔ فلاں پارٹی پر اثر و اقتدار قائم ہو جائے یا پھر یہ کہ چندہ خان بہادری کی۔ آنریری مجسٹریٹی کی، نائٹ ہڈ کی۔ غرض کسی معزز منصب یا خطاب کی قیمت سمجھ لیا جائے۔ شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر حسرت و یاس میں پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کیلئے
جو کچھ ہو رہا ہے سب اخبار کیلئے

ایک دوسری جگہ عبرت و حسرت کے اس گنجینہ کو شوخی و ظرافت کے دو شالے میں ڈھانپ کر پیش کرتے ہیں ؎

چرخ نے پیش کیس کہہ دیا اظہار میں قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مدید آوارہ ہیں بیبیاں اسکول میں شیخ بھی دربار میں

انتشار ملت کی اس سے صحیح تصویر اور کیا ہوگی

حمایت، مذہب کے دعوے اب بھی زبانی بہت کچھ کیئے جا رہے ہیں لیکن عموماً اس طبل بلند بانگ کے پیچھے حقیقت کیا ہوتی ہے؟ یہی نہ کہ ذاتی مخالفتوں، مخاصمتوں کی تسکین کا موقع ہاتھ آجائے اور مخالف کی رسوائی اور بدنامی جی بھر کے ہو رہے۔ مخالف اگر وہابی ہے تو آپ اس کی زد میں اپنے کو صوفی کہنے لگے، اور اس کی وہابیت کو خوب خوب اچھالئے، اگر حریف بدعتی ہے تو آپ اس کے جوڑ پر اتباع سنت بن جائیے، اس کے بدعتی ہونے کو خوب چمکائیے۔ خوب پھیلا دیجئے، اکبر کی قلم یہ سادہ تصویر یوں پیش کرتا ہے بلاغت کے رنگین نقش کا اس پر اضافہ ہے

ہاؤں کے کبھی پیرو نہ ہوئے ہاں اس کیلئے لٹھ تان لئے
مذہب نے ہمیں پہچان لیا ہم اس کو نہیں پہچان سکے

خدا فراموش نظام معیشت، اور خود پرست آئین، معاشرت اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ امن و عافیت کا نشان نہ رہا، انبساط قلب و سکون خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے۔ آئین ہمدردی کے بجائے فلسفہ تنازع للبقا اور کارزار "حیات کا رائج ہوگیا۔ زندگی کی ضرورتیں گراں ہوئیں، بیکاریاں ارزاں ہوئیں۔ بلاکتیں بڑھیں[1]، عمریں گھٹ گئیں، اطمینان میں کمی آئی محبتیں مٹیں، خصومتیں ابھریں، خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے تمدن اور تہذیب کی اس زندگی سے عقبیٰ جیسی سنورتی ہے اسے "توکل" پر اٹھا رکھئے۔ آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوتی جاتی ہے۔

---

[1] یہ منظر کشی۔ انگریزی دور کی ہے۔

گلشن مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے۔ اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکے، ہاں اپنے اوپر اختیار اب بھی باقی ہے۔ زبان پر مرثیہ ہے، لب پر آہ ہے، آستین آنکھوں پر ہے۔ اس کو ہٹا کر دیکھیے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شاید کہ مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی کچھ قیمت لگا سکے ؎

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں	باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل	گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کر دلوں میں ٹوٹیں	بنئے جو فطرتی تھے اب وہ ادھڑ رہے ہیں
سطح زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو	نظروں میں پھلجھڑی ہے گویا پھول جھڑ رہے ہیں
حلق تو ہیں پھیلائیں اور بھرتے ہیں شکم بھی	لیکن امید کیا ہو جب دل اجڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کس کی کریں گے زینت	لفظوں میں یہ نگینہ کیوں آپ جڑ رہے ہیں

فلسفہ کو تو چھوڑئیے کہ یہ تو خود ہی ظنیات و احتمالات کا بھول بھلیاں ہے۔ سائنس کو لیجئے کہا جاتا ہے کہ یہ قطعیات اور یقینیات کا ہادی ہے اور سائنٹفک ترقیاں مخصوص ومختص ہیں تمدن جدید کا۔ لیکن یہ ارشاد ہو کہ یہ آلات اور نت نئی ایجادات والی ترقیوں سے دنیا میں برکتیں زیادہ پھیلی ہیں یا لعنتیں؟ مجموعی طور سے ان سے اب تک دنیا کے ذخیرہ مسرت وراحت میں اضافہ ہوا ہے۔ یا جنگ و جدال میں۔ قتل و غارت کی جعل سازی ہوکر بازی میں؟ ان سے تحریک و تقویت انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ پہونچی ہے یا جذبات بہیمی کو؟ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں آہ سحر کے ساتھ وہ صاحب اور صاحب کے لائے ہوئے سائنس کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنا اخلاق اپنا جوہر شرافت سب آپکی خوشی پر نثار کردیا تھا

اپنوں کو بیگانہ بنالیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو تشریف آوری سے
الٹی مصیبتیں بڑھ رہی ہیں ؎

میرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا چکر دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دور میں تھے مگن تھے تمہارے دور میں باپ خوش ہیں

مشرق و مغرب کا جو فرق ہے وہ مشرق و مغرب کا فرق نہیں بعد المشرقین ہے۔ جزئیات میں نہیں کلیات میں ہے۔ فروع میں نہیں اصول میں ہے، غرض یہ نہیں جبلت و سرشت میں ہے۔ وہ مادیت میں مست ہیں۔ روحانیت میں غرق وہ تجارت و ثروت کی گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہم صبر و قناعت کے حجرہ میں فقر کی کملی لپیٹے ہوئے وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دھن میں ہیں ہمیں اپنے عرفان نفس کی کوششوں سے فرصت نہیں وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مساوات کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے۔ ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ عقل کی انتہائی ترقی اسے سمجھ کر اچھل پڑتے ہیں کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ ہم بدمستی و بے ہوشی میں بھی نعرے لگاتے تو یہ انسان خدا میں گم ہے۔ اکبرؔ اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی — مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈاروِن بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

اکبرؔ کرے واعظانہ تھے حکم اخلاق بھی تھے۔ راہ راست کی جانب اشارہ

کرکے خاموش ہو جانے والے نہ تھے ، راستہ کی پیچیدگیوں ، راہ روکی الجھنوں سے بھی واقف تھے ۔ اس لئے مسافروں کو راہ کے پیچ و خم اور منزلوں کی مشکلات کی بابت بھی ہدایتیں دے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہیں، پیچیدہ واقع ہوئے ہیں۔ حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا سا بچہ بھی آنکھیں بند کرکے رٹ ڈالے۔ جذبات کی کشش اپنی سمت ہوتی ہے عاقبت اندیشی کا فتوی دوسری جانب اور پھر خود جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش و کشمکش۔ اکبر نے کہیں کہیں ان کتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں جابجا ان کی حکیمانہ فکر دعاخانہ نظر نے اخلاق و معاشرت کے محض جزئیات ہی نہیں بلکہ فلسفہ اخلاق کے اصول کو لیا ہے۔ اور بنیادی مسائل کو کھول دیا ہے۔

شباب کی بدمستیاں اور بے احتیاطی کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم ساتھ ہی مذہب و اخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کل چار مصرعوں کے اندر (بھلا چار مصرعوں میں کی بھی کوئی ابساط ہے) پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں آپ ابھی اسی کو دیکھنے ہی ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک علامت کو بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ ان کی داد بھی دیتے نہیں پاتے کہ چٹ پٹ وہ ایک نسخہ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں۔ مکمل تشخیص اور علاج بھی چار مصرعوں میں ؟

نیچر کو ہوں خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا اور نفس کی خواہش بھی ہے روا

شیطان کا ساتھ البتہ برا اور خوف خدا ہے اس کی دوا

دین مذہب کی تحصیل بہتوں نے محض ایک علم یا فن کے طور پر کرنا شروع کی یعنی بجائے اسکے کہ اس کو برتیں، اس کو اپنی زندگی میں نبائیں۔ اسے ایک مسلک حیات قرار دیں۔ محض کچھ اس کے کچھ مسائل یاد کر لیتے ہیں مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے یا پھر دوسروں کی لتاڑ کرنا۔ اکبرؔ کا قول ہے کہ مذہب واخلاق سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انھیں جزو زندگی بنا لیا جائے، نہ یہ کہ ان کے قیل وقال سے کام محض گرمی محفل کا کام لیا جائے لیکن عمل میں ظاہر بینوں کو لذت کہاں۔ نفس کو لذت تو دوسروں ہی کو بتلانے پڑھانے سکھانے میں آتی ہے کہ اس میں نفس اپنی بڑائی محسوس کرتا ہے ؎

علم دین حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی
صرف سکھلانے میں لذت ہے عمل میں کچھ نہیں

زلیست کا مصرعہ بنے خود آہ سوزاں لب پہ لطف
ورنہ اے اکبر تری نظم و غزل میں کچھ نہیں

مذہب کا لیبل چپکا لینے، مذہب کا نام محض رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل نے ایمانیات میں عقیدہ توحید اور اعمال میں درستی اخلاق جب یہ حاصل ہے تو سب کچھ حاصل۔ یہ نہیں حاصل تو کچھ بھی نہیں حاصل۔ باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بوسیاں ہیں ؎

میرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں
جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں برے جو ہیں کافر ہیں

وہی ہے پاک طینت لو لگی ہے جن خالق سے
نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست میں وہ طاہر ہیں

مذہب کی حیثیت انفرادی سے زیادہ جماعتیں تو پہلے بھی تھی لیکن اب تو کہنا چاہیے کہ یہی جماعتی حیثیت اور سب حیثیتوں پر غالب آگئی ہے۔ کوئی شخص اگر عیسائی ہے تو اس کے معنی اب یہی رہ گئے ہیں کہ اس کا میل جول، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کے طور وطریقے فرنگیوں کی طرح ہوں گے سال میں بڑا دن منائے گا۔ خوشی کرلیگا۔ کیک کھائے گا۔ ہفتہ میں اتوار کو کام کاج بند رکھے گا۔ ملنے جلنے میں رہے گا۔ عجب نہیں گرجا بھی جائے۔ کوئی صاحب اگر شیعہ ہیں تو معنی یہ ہیں کہ محرم میں مجلسیں کریں گے۔ عزا و ماتم میں پیش پیش ہوں گے۔ آمد و رفت شیعوں کے یہاں رکھیں گے۔ کوئی بزرگ اگر سنی ہیں تو میل جول اہل سنت سے رکھیں گے۔ مدح صحابہ کے جلوس میں شریک ہوں گے۔ گھر میں ریت رسم سبنوں کی سی رکھیں گے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اپنے جماعتی ماحول میں تغیر کر دیا فلاں فلاں کے بجائے فلاں فلاں سے تعلقات رابطے بڑھ گئے۔ عقائد کا سوال بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تعلق صرف خدا اور بندے کے درمیان ہے یہاں گفتگو مذہب کے ظاہری و حاشری مجلسی پہلو سے ہے اس لئے اکبر کہتے ہیں کہ معتقدات کے کرید کی حاجت دنیا کو بالکل نہیں۔ دیکھنے کی بات تو صرف اتنی ہے کہ وضع اور طرز اعمال و اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہی امر قومی سمجھے نہ فعل ذاتی — معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا دفاتی
شیعہ ہوں یا کہ سنی، لالہ ہو یا برہمن — مذہب کو صورتوں سے سب پاتے ہیں عموماً

پولٹیکل ضرورت بیشک تھی اس کی اول — اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل
اچھا برا نہ کہو کہ دو تم مذہبی بنا پر — اخلاق اس کے دیکھو ہے اصل تو یہ جوہر
تعلیم جو ہے عمدہ صحت اگر ہے اچھی — پاؤ گے اس کو اچھا طبیعت اگر ہے اچھی
ناری ہے یا کہ ناجی اسکا بیان نہیں ہے — سوشل طریق یہ ہے اور وہ تو راز دیں ہے

دنیا میں قانون تکوینی کچھ ایسا رکھ دیا گیا ہے کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں۔ ایک آج ملازمت سے موقوف ہوا یا پنشن پر رہا، اس کے گھر میں ماتم برپا ہو رہا ہے لیکن جس نے اس کی جگہ پائی ہے اس کے گھر جا کر دیکھئے کیسے شادیانے بجتے ہوتے ہیں پرانی آبادی ویران کر کے محکمہ آرائش بلدہ ایک خوشنما خوش فضا پارک بنواتا ہے خلقت وہاں تفریح کے لئے امنڈی امنڈی گھر کر جمع ہوتی ہے اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیوں کا مجمع رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال کیا گیا۔ کتنے بھرے پرے گھر مسمار ہوں گے۔ جب جا کر یہ قطعہ زمین پارک کے لئے نکلا ہے ان ہنستے بولتے گھر والوں پر کیا گذری ہوگی اپنے پیارے گھروں کو چھوڑنے کے وقت، اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے وقت انہیں کھودتے دیکھ کر اپنے کھیل کود کی جگہ اپنے کھانے پینے لیٹنے سونے کی جگہ پر پھاوڑے چلتے دیکھ! فاتح اپنی فتح مندیوں کے جشن مناتا ہے۔ بھولا ہوا بالکل بھولا ہوا کہ کتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئیں۔ کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے خاندان برباد۔ کتنے گھر بے چراغ سے

یہ بات صاحب مجھ سے سن لے کتاب میں اس کو کیا پڑھے گا
حدود دنیا کے ہیں معین جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

انسان معصیت سے اگر ہاتھ کھینچتا ہے تو عموماً جب گناہ کی قوت سلب ہو چکی ہوتی ہے۔ یا اس کے سامان مفقود ہو چکے ہیں ورنہ جب تک قوت سامان

موجود ہے۔ نفس پرستوں اور سیاہ کاریوں کا معاملہ ذرا مشکل سے ختم ہوتا ہے ؎

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے   مگر اس بزم میں سچ یہ ہے کہ جی ہاں ہے بہت
وعظ تقویٰ نہ کہو رحم کرو اکبر پر   چشم بد دور ابھی طاقت عصیاں ہے بہت

نیکی اور بدی آخرت میں ثواب و عذاب جو کچھ بھی مرتب ہوگا وہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ ایک بین فرق تو دونوں کے درمیان تو اسی دنیا میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی اطمینان و سکون پایا جاتا ہے۔ اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب لاحق رہتا ہے ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب
دیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

محض کتابی معلومات انسان کے جوہر باطن کو جلا دینے کے لئے کافی نہیں اس کے لئے اچھوں کی صحبت لازمی ہے۔ زندگی پر اثر زندہ شخصیت کا پڑتا ہے۔

ایمان میں قوت، عمل میں رسوخ، زندہ معلم کے واسطے سے نصیب ہوتا ہے۔ عالم بے عمل وہی کہلاتے ہیں جن کے دماغ کتابی معلومات سے آشنا ہیں۔ لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھلاتے ہیں   آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے   وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

ایک اور موقع پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے
رہیئے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

انسان کو اپنے کے خلاف مزاج دنیا میں ہزاروں واقعات ملتے رہتے ہیں لیکن کارخانوں دھر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ نظام کائنات تو اس کی مرضی کا نہیں کسی اور ہی کی معیت کا پابند ہے۔ اس لئے مآل اندیشی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان ہر نا ملائم لمحہ پر ہر حادثہ پر صبر و تحمل بلکہ رضا و تسلیم سے کام لینے کی عادت ڈال لے یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہر طرح خوشگوار بنا دیں گے۔

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیونکر دل | بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں
چل بسے چھوٹے بڑے تھا جن سے لطف زندگی | مجھ پہ کس کو ناز ہے میں ناز اب کس پر کروں
وصل کی شب جب موسم ہوہی جائے گی بسر | لطف اٹھاؤں یادرازی کی دعا شب بھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص غایت و مصلحت کے ماتحت حرکت کر رہا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے فعل کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہے گا۔ ہر مبتدا کی خبر ضرور نکلے گی۔ ہر ادنی سے ادنی حرکت نتیجہ ضرور پیدا کر کے رہے گی۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔ اور دل کو عزت دلیتی و عشرت کی غفلتوں میں نہ پھسلنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گذر سکتی ہے۔ جام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی بیماری ہماری فراموش کاریاں غفلت شعاریاں ہوتی ہیں اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں بڑے لطف و خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبر اس فطرت خاموش کو بے حس نہ سمجھ | بال بصیرت سے کھتی دیدہ نرگس نہ سمجھ
راحت زیست کے سامان سے دھوکہ میں نہ آ | امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ | خاتمہ جس کا ہو افسوس اسے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسن عمل | بہر انجام یہ امرت ہے اسے بس نہ سمجھ

دل کا دنیا کی امیدوں سے بہلنا ہے برا | زندگی تلخ جو کر دیں انھیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ہمدردی اور دوسروں کی مشکلات کا احساس ان سے ہوا خواہی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے ساتھ ہی فطرت کی نیرنگیوں، شعبت تکوینی کی بے پایاں عجائب کاریوں کو دیکھ قلب عارف پر حیرت طاری ہونا ناگزیر ہے ؎

شیخ جی کی نظروں میں ہوں فقط | میری نظر میں ساری دنیا ہے
بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر | مجھ کو حیرت ہے ان کو غصہ ہے

علائق دنیوی کی جتنی کثرت ہوگی۔ اسی نسبت سے سامان غم والم بھی بڑھتے رہیں گے۔ امن و عافیت مقصود ہے تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہئے ؎

ایک جمتا ہے ایک پگھلتا ہے | کام دنیا کا یونہی چلتا ہے
دل تعلق بڑھا کے پچھتایا | پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسروں کی عیب چینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش رہتا ہے۔ لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطا کاریوں کی جانب کبھی بھولے سے توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کس پر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا
یہ تو کہیے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کہ وہی اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے انسان ساری دنیا کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے لیکن خود اپنے ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ

سکتا ہے ؎

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے
تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

اخلاق کی صفائی نفس کے تزکیہ کے لئے محض گوشہ نشینی کافی نہیں۔ اصل شے قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے۔ اچھی باتوں کے داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ ان پر عمل کر دکھانے والا کم ہی نکلتے ہیں ؎

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری — خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے
مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند — خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری دنیا پر ہمیشہ مسلط رہی ہے اور اب تو کہنا چاہیے کہ ہر طرف وہی گھیرے ہوئے ہے۔ انسان دوسروں کی بدکاری پر انھیں برا بھلا کہنا اپنے لیے کافی سمجھتا ہے اور خود اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ گویا عبادت و حسن عمل کا بنیادی پتھر، اللہ کی حمد نہیں شیطان پر لعنت بھیجنا ٹھہر گیا ہے۔ یہ صورت حال اکبر کے فلسفہ اخلاق کے بالکل مخالف ہے۔ اہل فرنگ[۵] اگر ہمیں ناتوان و بے بس پاکر تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں تو اس کا یہ علاج ہرگز نہ صحیح ہے نہ کافی کہ ہم بس انھیں کوستے کاٹتے رہیں ان کے طور طریق پر لعنت بھیجتے رہیں۔ ہم کو اصلی فکر ترقی و اصلاح کی کرنا چاہیے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اس شیطانی دور میں شیطنت کی یہ ترکیب خوب نکالی ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کو اس پر لگا دیا ہے کہ وہ شیطان پر لاحول پڑھنے

۵؎ زمانہ تحریر ۱۹۲۲ء۔

میں لگے رہیں۔ اور حمد و مناجات و توحید حسن عمل کے لئے وقت نہ نکال سکیں ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی
خدا کی حمد کیجیئے ترک بس مجھ کو برا کہیئے

• ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ حریف اگر ہمارے اوپر ستم پر ستم توڑ رہا ہے۔ اور ہم ہیں کہ بجائے اپنی اصلاح کے مال وتصحیح اعمال کے محض اس پر لعنت بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں۔ تو تباہ ہم اور وہ دونوں ہو کر رہیں گے۔ قانون فطرت انتقام دونوں سے لیگا۔ حریف سے اس کی زیادتیوں کا ہم سے ہماری کوتاہیوں کا۔ اس سے اقدام جور و ستم کا، ہم سے غفلت و جمود کا۔ عدو کی تباہی ہماری فلاح کی خود بخود مستلزم ہرگز نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو اپنی قسمت یہی رہے گی
زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہے گی
یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح امید کیا
یہی ہے زلف بتاں کا سودا تو میری شامت یہی رہے گی
عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیان غیر کیا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہے گی

سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے سارے اولیاء، انبیا کا بتایا ہوا سمجھایا ہوا راستہ ہے

صد ہزاران پیر بر وے متفق

یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی و بیزاری دل میں لو اور لگن، کسی اور ہی کی لگی ہے البتہ ہاتھ پیر، چلتے پھرتے حرکت کرتے اس دنیا میں رہیں بقول عارف رومؒ ؎

ہیچ کنجے بے دھر و بے دام نیست　　خبر بجلوت گاہ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف نے بھی کی ہے

جو اہل دنیا کا رخ کرو گے سکون خاطر کبھی نہ ہوگا

شریک غفلت بہت ملیں گے، شریک عبرت کوئی نہ ہوگا

یہی ہے مذہب کا جزو اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقدم

نئے طریقے ہیں لیکن اے دوست ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آواز حق کی منادی کر دی گئی تھی کہ اطمینان قلب و راحت دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں اور اپنی بدعملیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ اکبر کی آواز بھی اسی آواز حق کی صدائے بازگشت ہے۔ خلقت کی اصلاح دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ انھیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا کان لگا کر سنیئے ؎

یہ عزم تراسعی سے دم ساز ہو کیوں کر

اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز کیوں کر[1]

اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام　　طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہے یہ کام[2]

---

[1] جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے وہ خود تمہارے ہاتھوں سے آتی ہے (شوریٰ ع ۴)۔ تمہیں جو کچھ بھی برائی پیش آئی ہے خود تمہارے نفس کی ‘‘کی ہوئی ہے’’ (نسا، ع ۱۱) خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے (رعد ع ۱۳)

[2] خدا ہر قسم کی فراہمی اسباب پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں (کہف ع ۵)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳ پر)

بے طاقت و نیکی نہیں، تاثیر دعا کچھ — آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ[۵۱]
منظور مفاخر کا اگر تجھ کو سبق ہے — تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے[۵۲]
یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل — اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل[۵۳]

نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے
کھوٹے کو جدا کر دے وہی بات کھری ہے[۵۴]

لیکن یہ سارا دفتر وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف، اور فطرت کی رفتار تکوینی، مشیت الٰہی کا رُخ دوسری طرف، جس مشیت نے بڑے بڑے انبیاء اور رسل کو ظاہری اور قریبی نتیجہ کے لحاظ سے ناکام ہی رکھا۔ جس حکمت تکوینی نے خدا معلوم کتنے موکوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲ سے آگے) ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے (بقرہ ع ۲۰) حکومت و اختیار صرف خدا کا ہے (یوسف ع ۵)

۵۱ مسلمانوں کی فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے بس جو شخص برا کرے گا اس کی سزا پائے گا (نساء ع ۱۸)

۵۲ ۔ وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا تمہیں میں کافر بھی اس نے پیدا کئے اور مومن بھی" (تغابن ع ۱)

۵۳ ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں (آل عمران ع ۱۴)

۵۴ تم میں جو سب سے زیادہ پاک باز ہے وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہے (حجرات ع ۲)

جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی ہے (فاطر ع ۲)

میں صورت کے اعتبار سے کفر کو ایمان پر اور ظلمت کو نور پر غالب رکھا، اس کی رفتار بیسویں صدی کے ایک مصلح شاعر کی خاطر فرق کیوں کر پڑ سکتا تھا؟ ہدایت وگمراہی کے دور کا آخری سلسلہ انسان کے نہیں انسان آخر ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کارخانۂ کائنات کی بنیاد دہر کی جس غفلت پر رکھی گئی ہے اس پر یہ برابر چلتا رہے پیمبروں جیسی مقبول و برگزیدہ ہستیاں بھی اس تماشاگاہ عالم میں اپنا جلوہ حسن ادا، کمال وجمال کے ساتھ ادا کر کے رخصت ہو گا لیکن چند ہی روز میں یہ حال بھی ماضی بن جائے گا۔ یہ "آج" بھی "کل" میں تبدیل ہو جائے گا۔ حال کی تازگی ماضی کا افسانہ پارینہ بن جائے گی اس وقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔ احساسات خود ہی تبدیل ہو چکے ہوں گے، عیب ہنر بن جائیں گے۔ اور کمال کا نام بے کمالی پڑ جائے گا۔ عقل کو جنوں کا لقب دے کر پکاریں گے اور جنوں کی تعبیر عقل سے کریں گے ؎

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون سی چیز گم ہو گئی۔ شباب کی لذتوں اور مستیوں میں پڑ کر یاد بھی کس کو رہ جاتا ہے کہ بچپن کی معصومیت کا زمانہ رخصت ہو گیا۔ بے فکری کا زمانہ خواب وخیال بن گیا۔ اور نئی نئی فکروں اور ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر آ پڑا ہے! آنکھ کھلتی ہے مگر کب؟ جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ کچھ ایسا ہی حشر ہماری مشرقی اور اسلامی نہ سہی تو ہم مذہبی تہذیب واخلاق ومعاشرت کا بھی ہو۔ اکبر کے جام جم میں اس قلب ماہیت ایک ایک جزیہ کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہو گا کہ مرثیہ کا آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کر دیا جائے [۱]

(۱ اس کا حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ اب پیچ زلفوں میں نہ گیسوں یہ خم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردہ کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس سے روئے صنم ہونگے

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے ساماں غم ہونگے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اکلئے بے تال سم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہو گی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب کم ہونگے

گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے
کتابوں ہی میں دفن افسانہ جاہ و حشم ہونگے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

لہ (حاشیہ صفحہ ۱۴۴ کا ملاحظہ ہو) افسوس ہے کہ وہ "دوسرا وقت" آنے کا بھی وقت گذر گیا۔ مقالہ کی تقسیم شروع میں پانچ حصوں میں کی گئی تھی اور پانچویں حصہ کا عنوان معرفت و فلسفہ تھا لیکن مقالہ جب سنہ ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں رسالہ اردو میں نکلا تو اس کے صرف چار حصے نکلے۔ اور پانچواں حصہ سارا کا سارا لکھنے سے باقی رہ گیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں نظر ثانی کے اور پھر ۱۹۲۵ء میں نظر ثالث کے بعد نہ اتنی ہمت ہوئی اور نہ اتنی مہلت ہی مل سکی کہ تکملہ کے لئے محنت بجائے خود ایک مقالہ کی گوارا کی جائے۔ جون میں بہت زیادہ وقت کانٹ چھانٹ کی نذر ہو گیا۔ مقالہ اس طرح اب بھی ناتمام ہی شائع ہوتا ہے۔ اب دنیا میں خدا معلوم کتنے ارادے کتنے منصوبے اس طرح ناتمام رہ جاتے ہیں اور انسان اپنی پونجی چھوڑ کے آخری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ - اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اور مقالہ کا یہ حصہ اب اگر لکھا بھی جاتا تو عنوان اس کا بعینہ تو یہ رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ "فلسفہ" کو تصوف و معرفت سے یقیناً الگ کرنا ہوتا۔ ۱۹۲۲ء میں فلسفہ سے اتنی خوش خیالی نہ معلوم کیوں قائم رکھی کہ اس کو تصوف و معرفت کی سطح پر رکھ دیا تھا

(۲) نیا آئینِ اکبری[۵۱]

آئینِ اکبری تو وہی ایک ہے۔ سب کا جانا ہوا۔ خوب سا پہچانا ہوا شہنشاہ
اکبر کے انتظامی خط و خال کا آئینہ۔ اب اس میں جدت کوئی کیا پیدا کرے گا۔ پرانے
کو نیا کوئی کیونکر بنائے گا۔ اور اطلس میں گزی گاڑھے کا پیوند کہاں سے لاکر لگائے
گا۔ لیکن اکبر اکیلے تاجدارِ ہند ہی نام ہوا۔ اقلیمِ سخن کا ایک تاجدار اسی نام
کا گذرا ہے۔ صدیوں قبل نہیں ابھی حال میں اور کہیں بہت دور نہیں آپ
کے شہر کے نزدیک ہی الٰہ آباد میں! وہ قدیم آئینِ اکبری اگر اقلیمِ ہند
کے ایک فرمانروا کا مرقعِ کمال تھا۔ تو آج کا جدید آئینِ اکبری اقلیمِ معانی
کے کشور ستاں کا پرتو جمال ہے۔ البتہ وہاں داستان گو ابوالفضل تھا۔ اور یہاں
عرض پرداز ایک سراپا جہل ۔ خیر نمائش کے عجائب زار میں ایک عجوبہ کا اضافہ
اور سہی! ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں سخن گویوں
اور سخن فہمیوں کے حلقہ میں ایک کم سواد دیہاتی کی یہ جسارت اللہ اکبر! بس
یوں سمجھئے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں
کی لگ رہی ہوں۔ وہیں ایک گوشہ میں ایک نعلبند بھی کیل کانٹے سے لیس

---

۵۱ ۔ لکھنؤ میں ایک عظیم الشان نمائش سرکاری اہتمام سے جنوری ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا
اس نمائش گاہ کے حلقہ میں ہندوستانی اکیڈمی یو پی الٰہ آباد کی کانفرنس بھی ہوئی تھی یہ مقالہ
اس کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا۔

اپنا تحقیلائے موجود۔

ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی تقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے بڑا انقاب بھی یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، اور ان کی شہرت کو تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح کہ دنیا یعنی ایک دل لگی باز سمجھ ان کے لطیفوں پر مٹی رہی۔ ان کے شوخوں پر ہنستی مسکراتی ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی، اور کسی ایک آدھ کی گئی بھی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود وہ کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ سب نے دیکھا کہ ایک پیر مرد شکر لپیٹی ہوئی گولیاں سب کو تقسیم کرتے جاتے ہیں، اور کھانے والے ہیں کہ مارے لذت و حلاوت کے اپنے ہونٹ چاٹے جاتے ہیں۔ یہ کسی نے نہ پوچھا کہ گولیاں جراثیم کش کیسی زبردست ہیں، اور ان میں تریاقیت کس غضب کی ہے [۱]

دستانے اگر نرم اور گداز مخمل کے ہیں تو کسی پڑی ہے کہ جو ٹٹول ٹٹول کر دیکھے کہ اندر پنجہ گوشت پوست کا نہیں فولاد کا ہے۔ صاحب مثنوی معنوی کے اس رمز سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ وہ سرِ دلبراں ہے۔ "حدیث دیگراں" میں ادا کر جاتے ہیں۔ حضرت اکبر نے بھی کچھ سود تک اسی طرح کا بھر اور جو کچھ زمانے کے کڑے تیوروں کے لحاظ سے کھل کر نہ کہہ سکے۔ اسے قہقہوں کے شور اور تالیوں کی گونج میں کہہ گئے۔ اور معذرت خواہی یہ کر گئے کہ ے

سرد موسم ہے ہوائیں چل رہی ہیں برفبار
شاید معنی نے اوڑھ رکھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے ہیں۔ مذہب اور روحانیت اخلاق اور معاشرت، تعلیم اور سیاست کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ

---

[۱] مقالہ کی تحریر کے وقت تک حضرت اکبر کی حیثیت صرف ایک ظریف شاعر کے طور پر مسلم تھی

التفات سے باہر کب رہنے پایا ہے اس ساری داستان دہرانے کی قوت کس میں ہے؟ اور اگر کوئی ہمت کر بھی جائے تو سننے والوں کو اتنی سکت کہاں؟ لیکن اکبر اپنا مخصوص پیام بھی لے کر آئے تھے۔ پھر پھر کر الٹ پلٹ کر اسی کی کرتے رہے۔ کوئی سنے یا نہ سنے۔ اور سن کر بھی نہ سمجھے بہر حال اپنا پیام انھوں نے سنا سب کو دیا۔ اسی پیام کا نام اگر آئین اکبری رکھ دیا گیا تو کیا کچھ بیجا ہوا۔

پیام کچھ ایسا دقیق اور پیچیدہ نہیں کوئی محض فلسفہ نہیں سیدھی سادی بات صرف ایک لفظ سے ادا ہو سکتی ہے پیام "خودداری" کا ہے مشرقی سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ، ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی بنا رہ مسلمان کے لئے تلقین ہے کہ خبردار اسلام سے نہ ہٹ۔ اسی ایک ترانہ کو خدا جانے کتنے دلکش نظموں میں کتنے دل آویز عروں میں بے شمار دہرایا ہے۔ نو آموز مشرقی کو دانش گاہ فرنگ میں داخل ہوتے ہی پہلا سبق جو ملتا ہے وہ بے حیائی اور بے ناموسی کا ہے جس کا نام استادوں کی اصطلاح میں حریت نسواں ہے "صاحب" اور "میم صاحب" کے کھلے خزانے میل جول کو، بے پردہ اختلاط کو وہ کہنے لگتا ہے کہ ہماری زندگی اب تک کوئی زندگی رہی ہے محض وہی گھریلو بے مزہ زندگی، وہی صبح سے شام تک ماں باپ کی اطاعت، بزرگوں کی رضا جوئی، بھائی بہنوں کا میل جول، نماز اور قرآن مجید، اور گھر کی انگنائی زندگی نام ہے آرٹ کا، "فائن آرٹس" کا "پکچر گیلری" کا ڈرامہ کا، ڈانس کا سینما، کا،" نائٹ کلب" کا۔ اپنی بہو بیٹیوں کو دوسروں کے پہلو بٹھلانے کا۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ خود رقص کرنے کا۔ اب پردہ اس کے نزدیک سب سے بڑی قید ہے۔ اور سب سے پہلے اسی قید سے وہ اپنے اسیروں کو رہا کرتا ہے۔

نتائج و ثمرات کی تلاش اکبرؔ کے کسی کلیات میں نہ کیجئے انھیں تو آپ روزانہ اخبارات کے صفحات میں عدالتوں کی کارروائیوں، کالجوں اور زنانہ کالجوں کے احاطوں میں اور خود اپنے گرد و پیش براہ راست اور بلا واسطہ مشاہدہ فرمالیں۔ اکبر سے ایک اس قسم کے مناظر سے متعلق صرف ایک سوال کر کے رہ جاتے ہیں ؎

کیا گذری جو ایک پردہ کے عدو رو کے پولیس سے کہتے تھے
بیوی بھی گئیں عزت بھی گئیں دولت بھی گئی زیور بھی گیا

اس بے نقابی اور بے حیائی کو عقل و فہم سے جس حد تک تعلق ہے یہ جہاں تک معیار و غیرت و حیا، کے موافق ہے۔ اکبر اس پر کوئی ناصحانہ خطبہ نہیں ارشاد فرماتے، کوئی فلسفیانہ مفاد نہیں سناتے۔ ایک رباعی میں ایک چبھتا ہوا سا فقرہ خود نہیں بیویوں کی زبان سے کہہ جاتے ہیں۔ فقرہ کو حسن قبول وہ عطا ہوتا ہے کہ اس چالیس پینتالیس سال کے اندر بے شمار بار زبانوں پر آچکا ہے محفلوں کو گرما چکا ہے۔ بوڑھے تو بوڑھے بچوں میں بھی کم ایسے ہوں گے۔ جو نہ سن چکے ہوں گے ؎

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپکا وہ پردہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

سیلاب بے عصمتی کے مقابلے میں ہمارے آپ کے بزرگوں اور مذہب و اخلاق کے رہنماؤں نے جو سب سے زیادہ مضبوط بند باندھا تھا۔ وہ خود عورت کی شرافت تھی۔ اپنے یہاں کی شریف زادیوں کی، اپنی بہو بیٹیوں کی۔ حیا و عزت کی ہم قسم کھایا کرتے اور کہتے تھے۔ اس خیال میں کہ دنیا اوپر کی اوپر ہو جائے۔ ان حیا کی پتلیوں کا آنچل بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟ اور اگر

فرض بھی کر لیا جائے۔ تو ان کے بھائی اور باپ اور بیٹے اور شوہر انھیں زندہ کیوں چھوڑنے لگے؟ یہ ہمارے مردانہ خون کی گرمی ہے کس دن کے لئے؟ آنکھ اگر بیجا اٹھی تو آنکھ ہی نہ پھوڑ کر رکھ دی جائے گی۔ پیر اگر بیجا پڑا تو پیر ہی نہ کاٹ کر پھینک دیا جائے گا۔ تہذیب کا لشکر جب حملہ آور ہوئی تو پہلی گولہ باری ہمارے ان قلعوں دار برجوں پر ہوئی اور ان کے آئین صاحب کے اقبال سے ہمارے یہ سب دھن اور دمدمے مسمار! وہاں تو سبق ہی اس کا ملا کہ اب تک جن نظاروں پر اپنا خون کھولاتے تھے ان پر فخر کرو انھیں انھیں اپنے حق میں نعمت سمجھو ناز کرو اپنی خوش بختی پر کہ بام ترقی کے زینہ پر قدم رکھنے کا شرف نصیب ہو گیا ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

اس دربار دربار میں تو عزت و تقرب کا معیار رہی یہ ہے کہ خود بھی ناچیے اور جو کل تک گھر کی ملکہ تھی اسے بھی چار دیواری سے باہر لا دوسروں کے ساتھ نچایئے

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

"بال" انگریزی ناچ کو کہتے ہیں اور "سر" انگریزی خطاب اور اردو میں پر سر اور "بال" کی مناسبت کیا خوب! زنانہ اسکول اور کالج اکبر کے زمانہ میں اچھے خاصے کھل چکے تھے۔ اپنی قوم کی صاحبزادیوں کو "چراغ خانہ" سے شمع محفل بنتے۔ اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ لیکن مادی و مالی ترقی کے آثار تو اب بھی کوئی نہ تھے۔ مذہب اور روحانیت کے تخیل کو الگ رکھئے کم از کم یہ تو

ہوتا کہ دنیا جنت بن گئی ہوتی۔ عقبیٰ چلی تو چلی دنیا میں ہاتھ آجاتی میثاہدہ اس کے برعکس ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ترقی کی پتیں ہم پیر جبڑھا کیں
گھٹا کی دولت اسے چپیں بڑھا کیں

وہیں ہر پھیرے آبا جی نصیبن
وہ گو اسکول میں برسوں بڑھا کیں

یہ نقش اول تھا، کلیات حصہ اول میں نقش ثانی کلیات حصہ سوم میں ملاحظہ ہو

مرقع میں آب و رنگ بیشتر سے زائد ؎

اک پیر[1] نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا
اک پیر[2] نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کچھ جوڑ تو ان کے ہوئے بال[3] میں رقصاں

وہ تو ہاتھ سے یوں بے ہاتھ ہوئے اور غیروں میں جذب بن کر رہے ہیں

باقی جو بچے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا۔

بیرادہ بناکمپ میں پہ بن گئیں آپا

مصرعہ کے الفاظ سن کر جا ہے خوب ہنس لیجیے معنی پر خیال کر کے طبیعت رونے پر آمادہ ہو جائے گی

بی بی نہ رہیں تو میاں بن بھی سدھارا۔

انجام ؎

---

[1] یعنی سرسید [2] شیخ محمد عبداللہ بانی گرلز کالج علی گڈھ، جسٹس کرامت حسین بانی مسلم گرلز کالج لکھنؤ ان دوسرے بزرگ کو حضرت اکبر پیر نسواں کہا کرتے تھے شعر بھی آچکا ہے

ترقی پر خدا کے فضل سے ہے بزم رنداں بھی
فقط پیر مغاں تھے آگئے پیر نسواں بھی

[3] انگریزی ناچ جس میں مرد عورت مل کر ناچتے تھے۔

دونوں کبھی ملتے ہیں تو گاتے ہیں یہ مصرعہ

آغاز سے بدتر ہے سر انجام ہمارا

ایک مسلمہ جی ہندو خاتون کو نصیحت کرتے ہیں اور نصیحت کے وقت ہنستے نہیں کہ کبھی سرے لکھنے پڑھنے سے روک دینا تھوڑے ہی منظور ہے مقصود تو فرنگن بننے سے روکنا ہے۔ ؎

پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی کا بنی رہو اور ــــ

اور یاد رکھو کہ ؎

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے   مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

حد سے جو بڑھ گیا ہے تو اس کا عمل خراب   آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

یہ کونسل اور اسمبلی اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی میں عورتوں کو ممبری کا حق کا حاصل ہوا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں ترقی کی رو یہاں تک کہاں پہنچ پائی تھی۔ لیکن نگاہ دور رس نے بہت سی باتیں آگے کی بھی دیکھ لی تھیں۔ پچیس تیس سال پہلے تقریباً ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء میں ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خودداری پر قائم رہنے والی نسل اب کہاں باقی ہے

چل بسے وہ جنہیں مقدور تھا خودداری کا

اب تو دور دورہ ان کا ہے جو خود ہی مغرب زدہ ہیں ؎

شرم مشرق کے عدو شیو مغرب کے شہید

ان کی ہنسی اور ان کی شوخی تک "صاحب کی ہنسی اور "صاحب" کی خوشی کے تابع ہے ؎

نئی رمضان باعث کرکٹ ہے بقر ٹی ہے عید

نئی تہذیب، نیا رنگ جہاں   حملہ گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

نتیجہ یہ نکلا ؏

زہرہ ممبر ہوں دو کر تھیں جناب خورشید

اس پر ؎

دبی آواز میں کہا کہ بھی جو کسی نے کہ جناب
کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید

آپ کے مردوں ہی کے کون سے کارنامے ہیں کہ اب آپ عورتوں کو اسٹیج پر لانے لگے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار
کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

اس وقیانوسیت کو اس زمانہ میں برداشت کون کر سکتا تھا ؎

لغو یہ تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور ؏

لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریق تائید

دولہا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت بیہودہ
ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ کیا ہے نظم بھر کی جان ۔

خود تو گرٹ پہ مر کے لیے جان دیے دیتے ہیں
ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

تماشہ کا آخری پردہ ؎

اکبر افسردہ شد از گرمی ایں طرز سخن
شیخ بگریخت در صومعہ خویش خزید

آدم کے نئے بیٹوں اور حوا کی نئی بیٹیوں کی زبان پر ترانہ مسرت ؎

کھل گئے ورنہ رہا شاہد مشرق کو حجاب
غل مچا ہے کہ بول اٹھے ہیں مغرب کا مرید

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد از پس پردہ تقدیر پدید

آج زندہ ہوتے تو اس وقت کے واقعات کو دیکھ کر خدا جانے کیا کیا کہہ گئے ہوتے اس وقت بھی قطعات میں رباعیات میں بہت

کچھ کہہ گئے ہو گئے ہیں۔ غزلیں تک اس پیام شاعر سے خالی نہیں۔ ایک پرانی غزل ہے " بیبیاں کب تک " " تیلیات کب تک " کی زمین ہے۔ اس میں یہ گل افشانی موجود ہے۔ ایک صدائے درد ہے کہ چین نہیں لینے دیتی کسی نہ کسی پہلو سے لب پر آہ بن کر آہی جاتی ہے ؎

بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
بٹھائی جائیں گی پردہ میں بیبیاں کب تک

تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک
جو منہ دکھائی کی ہے رسم پر مصر ابلیس

انجام جو ہونا تھا وہ آغاز ہی سے ظاہر ہے ؎

سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامی پردہ
مگر وہ کب تک اور انکی رباعیاں کب تک

غزل ۱۹۱۱ء کی ہے۔ یہ ۱۹۳۷ء ہے پینتالیس سال پہلے کا کشف اللہ اکبر خیال نہ گذرے کہ آئین اکبری کی یہی ایک دفعہ ہے یا اہم ترین دفعہ آزادی نسواں کا بے پناہ طوفان ہے اس آئین کا مرکزی نقطہ، تو وہی خودداری ہے اپنی شرافت کا تحفظ۔ اپنی آن بان کا تحفظ۔ جس جس مورچہ سے انھوں نے اغیار کو حملہ آور دیکھا بس اسی سمت انھوں نے اپنے الہامی پیادوں کے پرے جما دیے۔

پڑھ لکھ کر کون اپنے محلوں کے کھنڈروں میں پڑے رہنے پر قانع رہا ہے۔ " وہ پت دیدہ " اور " صاحب رسیدہ " ہونے کے بعد کس نے مسجد میں جاکر نماز باجماعت پڑھی ہے؟ یہ تعلیم اپنوں کو اپنانے والی ہے یا اور چھڑانے والی ہے؟ اکبر اس منظر کو دیکھتے ہیں مگر کن آنکھوں سے ؎

نہ مسجد میں نظر آئے نہ رہتے ہیں محلوں میں
ترقی پا کے بس مل جاتے ہیں مرگھٹ کے گلوں میں

اگلی سادگی اور اخلاص مندی اور مرکزیت کی جگہ قدم قدم پر خود غرضی ذاتی نمود اور نفسی نفسی کا زور۔ اور زبان پر قومی ہمدردی کا نمائشی وظیفہ ؎

نہ وہ مسجد نہ جماعت نہ وہ طاعت نہ دعا — نہ وہ گل ہیں نہ وہ گلشن کہ وہ سبزہ نہ ہوا
نہ قناعت نہ توکل نہ وہ خودداری ہے — جاہ و ثروت کی تمنا میں گرفتاری ہے

سب سے پہلا پھندا مشرق کی گردن کے لئے یہ تیار ہوتا ہے کہ خودداری سے دستبردار ہونا پڑے تو پڑے لیکن ایسی بابرکت۔ سرتا رحمت سرکار بھی دیکھنے میں آئی تھی؟ یہ ریل، تار، ڈاک، عدالتیں، کاؤنسلیں، یہ آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے والی ایجادیں پہلے خواب میں بھی نظر آئی تھیں؟ اس کا عکس اکبر کے جام جم میں ملاحظہ ہو ؎

بہت ہی ممد ہے اے ہم نشیں برٹش راج — کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے — تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے
عطا ہوئی ہے وہ اسپیکروں کو آزادی — کہ حاکموں میں ہے قال تو ہاں قول بھی ہے
محل صل علیٰ ڈاک و تار کی ہے روش — اگر یہ دل میں نمایاں عظمت رسول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں انریبل کی — جو التماس ہو ممدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی — کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل ہے رواں انجن — کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

یہی رنگ آگے چل کر اور نکھر جاتا ہے اور کاغذ کے پھول خوش رنگ خوش نما تو پہلے ہی سے تھے اب خوشبو دینے لگے ؎

کیوں نہ اپنے دل کو ان سے ملائیے لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ
ان کی بڑھتی سب مناتے ہیں یہاں خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ
ہر طرف ساماں ہیں آرام کے کھل گئی ہے ہر طرف ہر شے کی شاپ
ہو گئے روشن حدود آسمان علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ
ساری دھرتی دب گئی سائنس سے لگ گئے بائپ گیا دنیا سے پاپ

حضرت واعظ ہیں راضی رقص پر
دیر ہے کیا اب پڑے طبلہ پہ تھاپ

اپنی اصل اور اپنی پرستش بانے والے بھائی بند آپ کی نظر سے بارہا گزر رہے ہوں گے بس کی بات نہیں ورنہ اپنے چہرہ کے رنگ چھیل کر پھینک دیتے اپنے ماں باپ کا نام بدل ڈالتے، اپنی قومیت، وطنیت سب دیسی سے ولایتی بنا لیتے۔ اکبر کی نظر انسانیت کے ان مسخ شدہ نمونوں پر پڑتی ہے ان بیماروں کی مغرب زدگی پر وہ ترس نہیں کھاتے۔ کچھ زیادہ غصہ بھی نہیں کرتے۔ مسکرا کر رہ جاتے ہیں تبسم ہی برجگہ گا ہٹ کے قابل ہے ؎

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے
چارہ ہی کیا تھا فطرت جو یہاں جنم دے
جو جس کے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا
یاروں کے لئے ہٹ کے اجڑ ٹولوں کے لئے پھندے

مسکراہٹ کی جلوہ نمائی ہوچکی۔ اب ذرا ہنسی کی کھلکھلاہٹ ملاحظہ ہو۔ معنی کی طرف جائیے تو تمام نشتر رقت و مرثیت اور ظاہر تک رہیئے تو ظرافت ہی ظرافت۔ مدت کی بات ہے امیر خسرو کبھی کرے محبوب

میں گدائی کے لئے نکلے تھے۔ اور ایک صدا لگاتے چلے گئے تھے۔ اکبر نے وہی پرانا خرقہ نکال کر جا بجا پیوند لگا پہن لیا۔ ہاتھ میں کشکول گدائی وہی لب پر صدائے فقیرانہ وہی لبلاے تہذیب پر جان قربان اور ایمان نثار کرنے چلے ہیں۔ اور الاپتے جا رہے ہیں ؎

اے شوق وضع مغربی ورہا فگنہ می اتبری — ہر چند منفقت حکیم لیکن تو ازاں بالاتری
شیخم شہید جلوہ افتادہ در بیب شما — باشد کہ از بہر خدا سوئے شہیداں بنصری
سحر نگاہت ناز من کر تو طبیعت راز من — ہر نغمہ ات بر ساز من قصا عجائب دلیل
تو سینہ گستی دل شدم نیچر شدم بیوبل شدم — تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
ہر چند باتو سبندام از طعن اکبر خستہ ام — للہ الحق خاص کن بیلا بحق نیچری

شراب طہور کا مزہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیوی شراب کا سا ہوگا۔ یہی تندی، یہی تیزی، یہی جوش و خروش، اثرات اس سے بد بالکل الگ نہ کسی قسم کا نشہ نہ زوال بھل نہ خمار نہ گرانی ——— اکبر کے خمخانہ میں اس شراب طہور کے جام پر جام جتنے جا ہئے چڑھائیے۔ چلے جائیے

خودی کی بقا خود داری کے تحفظ کے لئے جو کچھ کہنا ہے محض مسلمانوں سے بطور سرگوشی نہیں کہتے اور بعض دفعہ تو رخ بالکل ہندوؤں کی طرف پھیر کر کہتے ہیں ؎

ہوٹل سے پرہیز تمہیں اب پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا کہ جب لاگ گئی لاج کہاں

اور کبھی ہندو بھائی ہندوؤں میں ایسا گھل مل جائے کہ ان کے غیر معلوم ہی نہیں ہوتے اور ان کے اپنے ہی نظر آنے لگتے ہیں ؎

زبان سنسکرت اس وقت پنڈت جی سے کہتے کہتی ہے ؎

کہ اچھا ہے مری الفت میں تمہارے دل میں رہتی ہے
میں خوش ہوں گی بلاشک تم اگر مجھ کو جلاؤ گے
مگر وہسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے

خوب جانتے ہیں کہ دربار فرنگ میں قدر نہ مسجد کی نہ مندر کی، پرستش نہ ملا کی نہ برہمن کی۔ اس سرکار میں تو ایک ہی اعزاز ہے خلعت غلامی! اور اس رجسٹر میں قومیت کا ایک ہی خانہ ہے۔ نیٹو یا کالا آدمی! وہ تمام تر عیش منائیں، آپ صرف ہل چلائیں۔ وہاں تمام تر خاجگی و حکومت، یہاں سرتاسر شکستگی و عبودیت، ان کی کوٹھیوں میں زر و جواہر کے خزینے۔ اپنی جھونپڑیوں میں مشقت و چاکری کے پسینے! یہ منظر تو ہم سب ہر روز دیکھتے ہیں۔ اکبرؔ کی زبان سے سنیئے تو بھی ٹریجڈی کامیڈی بن جائے اور حزنیہ گھڑی بھر کے لئے طربیہ میں تبدیل ہو جائے ؎

لقنے میں دیکھا تھا وہ پیتے تھے جام مے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں تو خود مست بادہ عشرت کے خم سے آپ — الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ
بولے کہ اس زمین ہی کوئی اور شعر بھی — میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقائے دریگان حضور — کل تم سے تم ہوئے آج تم سے آپ
ہنس کر دیا جواب انھوں نے الشاعت کا ورق — گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

یہ کونسل، اسمبلی، الکشن، ووٹ کے رنگا رنگ و خوش نما کھلونے اس بڑی تعداد میں اب نکل[۱] پڑے ہیں۔ لیکن ان کی اچھی خاصی کھیپ

---

[۱] زمانہ تحریر ۱۹۳۷ء

اکبر کے زمانہ میں بھی ولایت سے آ چکی تھی اور ہندوستان بہت سی بازیوں کے بعد اس نئی بازی کی بساط پر جھکا ہوا کھیل میں غرق دنیا و آخرت دونوں کو بھلا چکا تھا ــــ اکبرؔ ان کھلونوں سے لگاتے تو کیا البتہ جی بہلایا ان سے خوب ہی جو کچھ اپنی عینک سے دیکھتے دوسروں کو بھی دکھانا چاہیئے ــــ یہ اور بات ہے کہ دیکھتا کون، سرے سے وہ رہ ہی بصارت میں غائب ہو چکا تھا ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

یہی راگ ایک دوسرے دھن میں ؎

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹمٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے — جس پہ دیکھو لدے ہیں ووٹر
ٹیٹو ہے ووٹ کا ہی محتاج — آخر یہ کیا شئے یہ ممبری ہے
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں — کونسل تو ہے ان کی جن کا ہے راج
در اصل نہ دین ہے نہ دنیا — پنجرے میں پھدک رہی ہے مینا

یہی تصویر ایک اور رخ سے ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں ستم کیا ہے
خدا کی مار سے دونوں کی مار کم کیا ہے

باتیں کہتے تو سب ہی کے کام کی لیکن قدرۃ اپنی جماعت اور قوم

(مسلمانوں) کا غم اور کھائے جاتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے ہر وقت دیکھتے کہ کیا سے کیا ہوتے جا رہے ہیں۔ قدم بجائے کدھر کے کدھر جا رہے ہیں دل روتا مگر چہرہ ہنستا ہوا بنائے غم کی گھٹن کوشش تھی کہ قہقہوں کی گونج میں دب رہ جائے۔ لکچروں میں ترقی کا شور سنا خود بھی اپنے ہم قوموں کو ترقی کے طریقوں پر ایک طویل لکچر دینا شروع کر دیتے ہیں ؎

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ
خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے

بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم
تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے

یورپ میں پھریے پیرس و لندن دیکھیے
تحقیق ملک کا شغل و شام کیجیے

ہو جائیے طریقۂ مغرب پر مطمئن
خاطر سے محو خاطر انجام کیجیے

الفاظ کفر و فسق کو بس بھول جائیے
ہر عادت و طریق کا اکرام کیجیے

لہیئے جہاں میں وسعت مشرب سے نیک نام
مجھ کو مرید ہندوؤں کا رام کیجیے

رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر
دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے

سامان جمع کیجیے کوٹھی بنائیے
باصد خلوص دعوت حکام کیجیے

یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے
تکمیل شوق پستہ و بادام کیجیے

نظارہ مال سے تر و تازہ رکھیے آنکھ
تفریح و پارک میں سحر و شام کیجیے

انجیر نفتہ توڑیے کہہ کر خلاف شرع
مضمون لکھئے دعوئے الہام کیجیے

اور شعر یہ کہا ہے ؎

مذہب کا نام لیجیے عامل نہ ہو جیے
جو متفق نہ ہو اسے بدنام کیجیے

اس کے بعد قدرتاً بس اتنا ہی کہنا رہ جاتا ہے ؎

لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے
مردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجیے

ذرا آشنا دلوں سے پوچھئے کہ اس تصویر میں کچھ بھی مبالغہ ہے؟ اس شاعری میں کہیں سے بھی "شاعری" ہے؟ آج ہمارے علم، ہمارے ادب، ہماری زبان، ہمارے مذہب ہماری شرافت، ہماری تاریخ، کسی کی کچھ بھی وقعت ہے۔ "عزت ہے" اہمیت ہے۔ جب تک کہ "صاحب" کی منظوری، تصدیق اور خوشنودی کی چھاپ اس پر نہ لگی ہو؟ بس ایک "صاحب" کی بات بالا، اور اس کے علاوہ سب کچھ ہیچ، اکبر اپنی اس ہیچ میرزہ کو خوب محسوس کرتے ہیں ؎

دور فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں   تفرقہ دیکھئے ذرا اہم پر بڑے عجیب دن
جان سپرد ڈاکٹر مال سپرد آ بجناب   عقل سپرد ماسٹر روح سپرد ڈاردن

زندگی کا کوئی ایک شعبہ ہو تو کہا جائے، یہاں تو ساری کی ساری زندگی اسی غلامانہ ذہنیت یا آج کل کی اصطلاح میں اس INFERIUPTY-COMPLEX کی نذر ۔ فرنگستان کی باٹا کمپنی معزز ۔ اپنے ملک کا بڑا سے بڑا موچی بعض موچی۔ ہوٹل لٹا ہوا سہی اسکا کارندہ بہرحال مینجر سرا بڑی سی بڑی بھی اس کا مالک بیچارہ محض بھٹیارہ، گلی ڈنڈے کا نام آئے تو آپ شرما جائیں، کرکٹ اور ہاکی ٹیم کی کپتانی کا عہدہ پیش ہو تو چہرہ فخر و مسرت سے جگمگا اٹھیں ۔ فقیہ ہونا کٹھ ملائیت کے مترادف ایڈوکیٹ اور بیرسٹر ہونا اعزاز و مرتبہ کا پروانہ، غرض اپنی اعلیٰ و ادنی بڑی اور چھوٹی ہر چیز اس دماغی مرعوبیت کا شکار۔ اس ذہنی غلامی کی بیداوار! حضرت اکبر خود داری کے اس قحط کو، اغیار کے اس ہمہ گیر تسلط کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ لیکن کمال ضبط یہ ہے کہ دل کی دکھن کو بھی ظرافت کی پھلجھڑی بنا کر پیش کرتے ہیں ۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی

بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اور پھر ردیف قافیہ اور وزن بدل کر ؎

میرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں

مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

"صاحب" کی زبان سے طعنے برابر مل چکے کہ ہندوستانی طلبا سب کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد بھی وہ کلچر و آراستگی خیال اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں۔ جو فرنگی زادوں میں گھر گھر موجود ہے۔ اس طنز کے تحقیقانہ اور سنجیدہ جوابات تو بارہا ہو چکے۔ ایک لطیف جواب اکبر کی زبان سے سنیے۔ یہ طرز جواب حصہ ہے اکبر کا ؎

کر چکا جب کالج میں تکمیل فن | تب یہ بولے مجھ سے مسٹر ماریسن
گو کہ شہرت ہے تمہاری دور دور | تم سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور

استاد کے طعنے میں شاگرد عرض کرتا ہے حضور صاف یہ خطا کس کی ہے شاگرد کی یا استاد کی ؎

آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے | اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

مغربی استادوں کی زبان سے چند الفاظ ہم نے سیکھ لیئے ہیں۔ کچھ بے معنی سی۔ زبانوں پر وہی آموختہ رہتا ہے۔ اور دل اپنی مقاصد لا یعنی میں سرگرم۔ تعلیم اعلیٰ تعلیم، جبری تعلیم۔ آزادی ترقی، روشن خیالی، ارتقا، یہ چند منتر ہیں۔ جن کے مسحور کن اثر سے کون واقف نہیں۔ اکبر نے ان میں سے دو لفظ چندہ اور اسکول انتخاب کر لئے۔ اور انھیں ایک مخمس کی ٹیپ بنا ان سے خوب خوب کام لئے ہیں ؎

بکری کو ساگ پات کا سودا نہ رہا   بنگالیوں کو تجارت کا سودا نہ رہا

چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہ رہا   اور شاطروں کو مات کا سودا نہ رہا

اچھا ہوا ہے چندہ دو اسکول ہیں ہر ایک

بنیوں کو لحظہ سود کی فرصت نہ رہی   منعم کو داد و جود کی فرصت نہ رہی

لڑکوں کو کھیل کود کی فرصت نہ رہی   سودن کو نغمہ رود کی فرصت نہ رہی

اچھا ہوا ہے چندہ دو اسکول ہیں ہر ایک

اسی طرح برابر بر ترتیب جماتے چلے گئے۔ اور خاتمہ پر فرماتے ہیں ؎

پنڈت براجما کے بنارس پہ آ رہے   مرلٹ کے شیخ شہر بھی تو کس پر آ رہے ہیں

حالی غزل کو چھوڑ کر مسدس پہ آ رہے   ہم فرد تھے سو ہم بھی مخمس پہ آ رہے

ادراک اگر صحیح رہتا تو پھر بھی امید اصلاح تھی۔ لیکن جب سرے سے ادراک ہی غلط ہو جائے۔ سفید سیاہ اور سیاہ سفید نظر آنے لگے اور تعلیم قلب کی قلب ماہیت کر دے اور اکبر کی پیشن گوئی ؏

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

واقعہ بن کر رہے تو پھر علاج کس کے بس میں رہ جاتا ہے؟ اکبر کو حیرت بار بار اسی الٹی سمجھ پر ہوتی ہے اور دعوت وہ اسی کی دیتے ہیں کہ صحیح غور و فکر کرنے سیکھو اور اندھیرے میں وہم کو حقیقت کا درجہ نہ دے بیٹھو، یہ سارا دلفریب منظر ترقی محض سراب ہے یا حقیقتاً آب؟ ؎

آ رہے ہو جیسے تم کہتے ہو اس پہ اکبر   دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے

نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو   کیا ہو رہا ہے اثر کیسی گذر رہی ہے

دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

شاعر، ظریف شاعر، سہی بہر حال انسان ہی ہوتا ہے۔ دل میں ناسور پڑ چلے ہوں، تو بشرہ کو مسکراتا ہوا کب تک رکھا جا سکتا ہے دل کی کسک آخر پورے زور کے ساتھ زبان پر آ کر رہے گی۔ خود داری کا خون روزانہ اپنے گرد و پیش ہوتے ہوئے دیکھ شاعر کا دل خود خون ہو چکا ہے۔ اپنے عشرت کدہ کے کھنڈر پر آ کر رکتا ہے۔ در دیوار کی گری ہوئی ایک ایک اینٹ حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ دل بھر آتا ہے۔ لب پر آہ سرد ہے۔ اور زبان پر دھیمے سروں میں یہ مرثیہ ؎

پیر و مرشد نے کیا قوم میں یجیں پیدا — وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہو جائے جوبن پیدا

وہ تو نہ پیدا ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر — ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا

اور اس مرثیہ کے سلسلے میں پھر فرماتے ہیں ؎

پستی قوم کی جب آ گئے دل اے اکبر — اونچے درجوں میں ہوئے نقل کے دشمن پیدا

باپ کے خون سے جو ہو گی حمیت زائل — ہوں گے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا

صورت برگ خزاں دیدہ پھریں گے اڑتے — نہ بہار آئے گی پھر ہو گا نہ گلشن پیدا

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ — کون کہتا ہے نہ کر حسرت لندن پیدا

بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی تو نہ بھول — راہ قومی کا نہ تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

قوم قوم اٹھ پھر سنتے ہیں ہم قوم کہاں — تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا

مذہبی شاخ غنیمت ہے تری قومی ہستی — یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

سلف اسپلٹ کا پھر یاد رہے گا نہ سبق — پھر نہ ہونے کی یہ بحث تو دشمن پیدا

بزم تہذیب سے ہو جائیں گے قطعاً خارج
حس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہوں شیون پیدا

آئین اکبری کا آپ آغاز دیکھ چکے اب انجام ملاحظہ ہو۔ بچپن کی شوخیاں بڑھاپے کی جھریوں سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟۔ شادیانوں کی دھوم تھی؛ اب نوحہ کے بول بھی کانوں میں پڑ جائیں۔ آج ۱۹۳۷ء میں ہم آپ کو جو کچھ بچشم خود نظر آرہا ہے شاعر امت و حکیم ملت کی نگاہ کشفی نے اسے ۳۰-۳۵ سال قبل ہی صفائی کے پڑھ لیا تھا۔ آنکھیں پرنم ہیں دل کچھ بیٹھا سا جاتا ہے اور جو کچھ خود دیکھ رہے ہیں دوسروں کو دکھاتے جا رہے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی یہ پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے
بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہونگے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

انقلاب دہر اپنے وقت پر بہر حال آیا۔ آگیا وہ زمانہ کے غم کھانے والا اکبر نہ رہا۔ اور آرہا ہے وہ دن کہ خود اس نئے آئین اکبری کا تیار کرنے والا بھی نئے سے پرانا ہو لیگا منسیاً ہو چکا ہوگا۔

(۳۶)

ایک سچّا قصّہ[1]

کچھ کم تیس سال کا ذکر ہے۔ فرنگی تہذیب ساری مہذب دنیا کو مسخر کرچکی ہے۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں "صاحب" اور "میم صاحب" کے تمدن کی حکومت ہے۔ شہر میرٹھ کے ایک اینگلو انڈین۔ (پرانی اصطلاح میں یوروشین) لفٹنٹ کلارک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس وقت کے انڈین سب آرڈی نیٹ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں) تعینات ہیں۔ عمر قریب چالیس سال کے، توانا و تنومند، جذبات نفسانی سے معمور اخلاق روحانی سے کورے۔ میم صاحب سن میں ۸ سال بڑی اور پھر اس پر لاغر و بیمار

اس شہر میں قیام ایک اور صاحب بہادر مسٹر ایڈورڈ فلہم کا ہے سرکار کے محکمہ حسابات فوجی ملٹری اکاؤنٹس میں ڈپٹی اگزامنر کے عہدہ پر ہیں۔ عمر ۴۴ سال کی۔ میم صاحبہ خالص ولایتی ۳۰ سال کے سن کی حسن و جمال میں مشہور۔ سوسائٹی میں مقبول۔ میاں بیوی بچے سب خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ مسز فلہم کے یہاں بچہ ہونے

---

[1] صدق ۱۵ فروری سنہ ۱۹۳۹ء

والا ہوتا ہے۔ مرد ڈاکٹر سے مہذب سوسائٹی کو کیا شرم، بجائے کسی لیڈی ڈاکٹر کے خود لفٹننٹ کلارک بچہ جنانے آتے ہیں۔ اور زچہ کی برہنگی کے جو نظارے دائیاں جنائیاں کرتی ہیں۔ خود ہی کر جاتے ہیں۔ اب فریقین کی آنکھ لڑتی ہے۔ اور میم صاحب کنواری نہیں شادی شدہ صاحب اولاد "عین زمانہ زچگی میں ڈاکٹر صاحب پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔!۔ قربان جائیے۔ اس نفاست خیال و پاکیزگی جذبات کے چند روز بعد کلارک کا تبادلہ دلی ہو جاتا ہے لیکن دہلی و میرٹھ کے درمیان فاصلہ ہی کتنا۔ جب دیکھئے ڈاکٹر صاحب اپنے اعلیٰ شریفانہ جذبات کی تسکین کے لئے موجود۔ اور جن دنوں یہ ممکن نہ ہو تو ہجر کے دن اور فراق راتیں گذارنے کے لئے ڈاک ہے۔ سلسلہ نامہ و پیام۔ بیسویں صدی کے اس "مجنوں" کے پیامات شوق تو لیلیٰ نے فرط زید کی سے ضائع کر دئے۔ لیکن یہاں جنوں اتنی پیش بینی اور پیش بندی سے محروم اپنی لیلیٰ کے خطوط کے گڈ جمع کرتے گئے۔ اور ان خطوط کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ عریاں جذبات کے لحاظ سے بھلا کیا کوئی فرضی افسانوں "لیلیٰ کے خطوط" ان خطوط کا مقابلہ کریں گے ــــ ڈاک کا پتہ کلارک کے بھیجے ہوئے خطوط پر بجائے مسز فلپ کے مسز کلارک سن لکھا ہوتا تھا۔ اور میم صاحبہ خود بنفس نفیس ڈاک خانہ جا کر انھیں وصول کیا کرتی تھیں

کچھ روز بعد کلارک کا تبادلہ آگرہ ہو جاتا ہے اور ("عشق" کا نام تو اس کھلی ہوئی بہیمت کے لئے لیکر عشق کی مٹی پلید کیجئے نہیں ہاں نفس پرستی البتہ کہہ لیجئے) ناپاک نفس پرستی کی آگ

ہے کہ تیزی سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن شوہر کا وجود بہر حال
راہ کا کانٹا بنا ہوا۔ شیطان نے پٹی پڑھائی کہ یہی قصہ کیوں نہ پاک
کر دیا جائے۔ ڈاکٹر جس کا کام جان بچانا سمجھا جاتا ہے اس کے
لئے جان لینا کون سی مشکل بات ہو سکتی تھی۔ رائے یہ ٹھہری کہ
سنکھیا کی ایک پڑیا میم صاحب کے ہاتھ میں پہونچ جائے۔ وہ بھولے
شوہر کو وہ بہت ہی ہلکی ہلکی مقدار میں دی جانے لگے۔ اس میں وقت
تو خیر لگ جائے گا۔ لیکن تدبیر پٹ نہیں پڑے گی۔ عمل شروع ہو
جاتا ہے۔ اور کوئی ڈھائی مہینہ کی مدت بیت جاتی ہے۔ عورت
تہذیب جدید سے آراستہ پیراستہ عورت آخر کب تک نتیجہ کا انتظار
کرے۔ خطوط میں تقاضہ پر تقاضے ہونے لگے کہ تمہاری "صبر آزما"
مدت تو میری جان لئے کر رہے گی۔ خدا کے لئے کوئی صورت گلو خلاصی
کی نکالو۔ نفس کی ماری، عقل کی ماری اندھی، عورت کو تو نہ سجھائی نہ دیا
لیکن زہر ہلاہل اندر اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ فلہم صاحب رخصت
بیماری لیکر مسوری تبدیل آب و ہوا کے لئے گئے۔ ادھر کلارک کی منہ
مانگی مراد ملی ـــــ اتنے دنوں کے لئے قیام میرٹھ ہی میں کر لیا۔ مدتوں
کا ڈاکٹری تجربہ کام آیا۔ شیطان کے فضل و کرم سے ایک عرق طے
بنایا۔ جس کے پینے سے مریض پر علامتیں بالکل وہ طاری ہو جائیں جو گرمی
میں لو لگ جانے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ ۲۷ جولائی ۱۹۱۱ء کو فلہم
کے حلق سے پہلی خوراک اس عرق کی اتری اور معاً طبیعت بگڑی۔
مقامی ڈاکٹر آئے اور لو لگ جانے کا نسخہ لکھ گئے۔ علاج جاری تھا
کہ سفاک بیوی نے دوسری خوراک پلا دی۔ طبیعت اور زیادہ نڈھال

ہوئی۔ مریض میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ اور ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ مریض اب کام کے ناقابل ہوگیا۔ ملازمت سے سبکدوشی اسی وقت ہوگئی۔

مسرت نصیب شوہر کی رائے ہوئے کہ اب وطن مالوف انگلستان چل کر بقیہ زندگی وہیں بسر کی جائے۔ میم صاحب نے کہا آگرہ سے بہتر کوئی سرزمین نہیں قضائے الٰہی نے مہر تصدیق اس رائے پر ثبت کردی۔ ۸ نومبر ۱۹۱۱ء کو یہ جوڑا آگرہ منتقل ہوا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۱۱ء کو وہی مہلک برقی شوربہ اور گوشت میں ملا کر دیا گیا اور اب کی مرتبہ علاج کے لئے خود ملک الموت یعنی ڈاکٹر کلارک تشریف لائے آکر ایک انجکشن دیا اور تھوڑی دیر میں فلہم غریب قید ہستی سے آزاد ہوگیا۔

مسز فلہم اب آزاد تھیں۔ چند ہفتے خوب رنگ رلیوں میں گذرے۔ لیکن ابھی تو صرف پیر کی بیڑی کٹی تھی۔ ہاتھ کی ہتھکڑی ابھی باقی تھی۔ زاد و نژاد مسز کلارک کو وجود تو ابھی بہرحال تھا اور وہ کھٹک پیدا کئے ہوئے تھا۔ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیاہتا بیوی فرنگی تہذیب و قانون میں کہاں جائز — اب تڑپ تھی تو اس کی کہ یہ دوسرا کانٹا بھی راہ سے ہٹ جائے۔ اور زہر وائی مجرب ترکیب دماغ میں حاضر تھی۔ عمل مسز کلارک پر شروع ہوا مگر اب کی تدبیر کچھ زیادہ چلی نہیں — زیادہ تیز اور قوی زہر افشائے راز کے خیال سے خلاف مصلحت نظر آیا۔ بہرحال اب کی قرعہ انتخاب ایک دوسری ترکیب پر پڑا۔ قاتل آخر کرایہ پر بھی تو

مل جاتے ہیں۔ ستو کی رقم میں پانچ پیشہ ور خونیوں کا جتھا کرایہ پر مل گیا۔ طے یہ پایا کہ رات کو یہ لوگ بنگلے پر حملہ آور ہوں اور میم صاحب کا کام تمام کر کے کچھ سامان بھی لوٹ لے جائیں۔ تاکہ صورت حال معاملہ بالکل ڈکیتی کی سی رہے۔ سو کی رقم کلارک کی جیب سے نہیں مسز فلہم کے بینک کے کھاتہ سے برآمد ہوئی۔ نومبر ۱۹۱۲ء کی تاریخ تھی کہ پانچوں قاتل کلارک کے بنگلہ میں داخل ہوئے۔ کلارک خود اسٹیشن چلا گیا تھا ایک فرضی دوست سے ملاقات کا بہانہ کر کے دیر کے بعد جب لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ گھر کے وفادار کتے نے قاتلوں کا راستہ روک رکھا ہے! خود بکڑ کر کتے کو الگ بند کیا۔ قاتل سونے کے کمرہ میں آئے اور دم بھر میں مسز کلارک کو تلوار سے پارہ پارہ کر دیا۔

مسز فلہم نفس پرستی کی خوشی میں مست کہ اب آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی اور آئندہ عیش ہی عیش ہے۔ تقدیر اس فیصلہ پر ہنسی پولیس کے ہاتھوں اس برگشتہ بخت کے عاشقانہ خطوط کا ذخیرہ پڑ گیا۔ قرائن و قیاسات موجود ہی تھے۔ پورا بھید خطوط نے کھول دیا۔ فلہم کی نعش قبر کھود کر نکالی گئی۔ ڈاکٹری معائنہ ہوا جسم سے زہر کے ذرات برآمد ہوئے۔ ۲۷ فروری ۱۹۱۳ء کو فلہم کے قتل کا مقدمہ اور ۱۰ مارچ کو مسز کلارک کے قتل کا دوسرا مقدمہ چلا۔ پہلے مقدمہ میں کلارک اور مسز فلہم دونوں ملزم تھے۔ دوسرے میں ان دونوں کے علاوہ ان دونوں کے چاروں کرایہ والے قاتل تھے پانچواں قاتل اقبال جرم کر کے سرکاری گواہ بن گیا۔ مجسٹریٹ سشن جج اور ہائی کورٹ کی منزلیں چند روز میں پوری ہو گئیں۔

جرم دونوں پر ثابت سزائے موت کا حکم دونوں کو ملا۔ کلارک مع تین قاتلوں کے دیجو تھے ملزم کے خلاف شہادت پوری نہیں بہم پہونچی اس لئے اسے شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا گیا، اس وقت پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ مسز فلہم حمل سے تھیں جیل میں رکھی گئی۔ چند روز بعد ولادت ہوئی اس کے بعد بیمار پڑیں اور دنیا سے رخصت ہو گئی۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے کلیات حصہ سوم (صـ ۱۵۲ - صـ ۱۵۳) میں ایک طویل نظم اسی واقعہ سے متعلق ہے۔ اس نثر کے بعد اس نظم کا پورا لطف اب انشاء اللہ آئے گا۔ ملاحظہ ہو ؎

حال مسز کلارک و مسز فلہم کھلا
تھا کل بیان پیش عدالت کھلم کھلا

ان کو کرایا قتل اور ان کو دلایا زہر
تہذیب مغربی کی یہ تکمیل اور قہر

پردے پہ اعتراض ہو اور نہ ہو دوا
پالیگمی[1] پہ طعن ہو اور یہ ستم روا

فتنہ کا ہے قصور نہ مقتول کا
سب کچھ ہے یہ خرابی قانون کا قصور

پردہ نہیں طلاق میں آسانیاں نہیں
جائز کہیں تعدد ازدواج ہاں نہیں

فطرت کا اقتضا جو ہے کس طرح وہ رکے
پھر کیوں گناہ جرم کی جانب نہ دل جھکے

---

[1] تعداد ازدواج POLYGAMY

آسان ہو طلاق تو دل شاد کیجئے
بے قتل غیر اپنا گھر آباد کیجئے

پردہ جو ہو تو ایسے موقع بھی کم ملیں
کیوں بزم مے میں شوخ نگاہیں بہم ملیں

قانون مغربی میں روا ہو اگر نکاح
پھر کیوں یہ قتل زوجہ اولیٰ کا ہو مباح

جب پردہ و طلاق و تعدد روا نہیں
پھر بد معاشیوں کے سوا کچھ دوا نہیں

جانیں ہزاروں جاتی ہیں بچے بلکتے ہیں
مثانے جگر سے بھلا کب سرکتے ہیں

مغرب کا دل خو خواہر مشرق کے ساتھ ہے
یہ بھی گھروں میں ان کے لئے ملتی ہاتھ ہے

اکثر یہی ہے حالت قانون مغربی
آزادیوں کی قید میں روح الٰہی ہے پھنسی

بس ظاہری نمود چمک اور ادا میں ہے
دل کی خبر نہیں کہ وہ کس ہوا میں ہے

لکچر ہے اس طرف تو ادھر بے بسی ہے
اس سمت ناچ ہے تو ادھر خودکشی ہے

تعلیم عورتوں کی ضروری ہے لاکلام
لیکن جو یہ اثر ہے بس دور سے سلام

ہم کو کمال شوق سے تعلیم دیجئے

لیکن کچھ اپنے گھر کی بھی اصلاح کیجیے
ہم فائدہ اٹھائیں گے مغرب کے راج سے
لیکن پناہ مانگیں گے ایسے رواج سے

(۳)

ایک مختصر سا پیام
یوم اکبر منانے والوں کے نام[1]

۱۹۱۲ء ہے اور مہینہ غالباً اپریل کا ہے۔ لکھنؤ میں ابھی یونی ورسٹی قائم نہیں ہوئی ہے۔ صرف ڈگری کالج ہے۔ ایک طالب علم

---

[1] عالم پور (دکن) میں غالباً ۱۹۴۲ء میں یوم اکبر مسز راگھو نراد جذب وکیل کی صدارت میں منایا گیا تھا۔ یہ پیام اس لئے بھیجا گیا تھا۔ اور اس کے بعد صدق ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ جذب صاحب اکبر صاحب کے عقیدت مندوں میں ہیں اور خود بھی مشغلہ سخن رکھتے ہیں۔

بی اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الہ آباد گیا۔ اور اپنی پہلی فرصت میں یہی نوجوان شرمیلا اور بڑوں کی صحبت میں جھجکنے والا، شوق کے پیروں سے چل کر اور اشتیاق کے پر دہا سے اڑ کر عشرت منزل[۱] جا حاضر ہوتا ہے۔ پیر ظریف کا سن کوئی ۶۶ سال کا جسم لاغر و نحیف چہرہ دبلا اور دبلے چہرے پر جھریاں۔ لباس سادہ وضع و معاشرت سادہ ایک وسیع برآمدہ میں ایک آرام کرسی پر نشست، آنکھوں پر عینک، آنکھیں عینک کے اندر سے چمکتی ہوئی۔ قدرتی نہیں ڈاکٹر کے ہاتھ کی قدح کی ہوئی اس پر بھی پر نور گفتگو لطیفوں سے پر، ظرافت سے معمور بشرہ سے ذہانت کا ظہور، خود کم ہنستے ہیں دوسروں کو ہنساتے زیادہ ہیں فقرے گویا ڈھلے ہوئے پہلے سے سوچے ہوئے منہ سے نکل رہے ہیں۔ جو ملنے آیا آیا ہے وہ سن میں ان کی بڑی اولاد سے بھی چھوٹا لیکن باتیں اس سے یوں گھل مل کر رہے ہیں جیسے وہ ان کا کوئی پرانا دوست ہے۔ ہم سن و بے تکلف ـــــ ان پیر ظریف کو آپ نے پہچانا۔ اب یہ تھے مشہور و نامور شاعر اور حکیم و عارف حضرت اکبر۔ اور ۱۹۱۴ء کے شرمیلے نوجوان کو آپ نے جانا یہ نامہ سیاہ ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یوم اکبر کیلئے

---

[۱] - حضرت اکبر کی حویلی کا نام جو بڑے صاحبزادے سید عشرت حسین کے نام پر تعمیر ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب ہند کے بعد ..... یہ حویلی بھی انقلاب کے زد میں آئی عشرت حسین مرحوم کے تینوں صاحبزادے رفتہ رفتہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اور اب ۱۹۱۵ء میں یہ کوٹھی سرکاری کسوٹی میں کے قبضہ میں ہے!۔ بس ہے نام اللہ کا۔

پیام نویس !

سنہ اب یاد نہیں اور مقام کا اظہار کچھ ضروری نہیں
بہر حال اودھ کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے حضرت اکبر کے صاحبزادے
سید عشرت حسین صاحب وہاں کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اکبر صاحب بھی
وہاں آئے ہوئے ہیں اور ریلوے اسٹیشن پر موجود ہیں۔ شہر کے
تحصیلدار صاحب بھی اتفاق سے وہیں وارد ہوتے ہیں۔ کوئی انھیں بتاتا
ہے کہ یہ نامور شاعر حضرت اکبر ہیں۔ یہ سن کر بھی وہ کچھ زیادہ التفات
نہیں کرتے۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب خود آجاتے ہیں۔ اور حاضرین سے
تعارف کراتے ہیں "آپ لوگوں نے پہچانا؟ یہ میرے والد ماجد ہیں"
اب کیا تھا تحصیلدار صاحب فوراً ملتفت ہو جاتے ہیں اور معذرت
کے ساتھ فرماتے ہیں۔ معاف کیجئے گا یہ خبر نہ تھی کہ آپ ڈپٹی صاحب
کے والد ماجد ہیں۔ اکبر نے فرمایا "نہیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔
ایک قصہ سنئے۔ ایک بار یورپ میں کیا ہوا کہ اللہ میاں مجسم ہو کر زمین
پر اتر آئے۔ گرجوں جاکر ایک ایک سے کہا کہ "میں خدا ہوں، خالق ہوں
پروردگار ہوں کوئی مخاطب ہی نہ ہوا۔ اس پر فرمایا ارے مجھے پہچانا تک
نہیں میں ہوں عیسیٰ مسیح کا باپ" بس اسی تعارف کی دیر تھی سب کے
سر تعظیم کے لئے جھک گئے ـــــ یہ تھا نمونہ اکبر کی برجستہ لطیفہ
گوئی کا ـــــ

سن غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء ہے اکبر لکھنؤ میں امین الدولہ
پارک کے ایک بالا خانے پر مقیم ہیں۔ ایک صاحب بی اے ایل ایل
بی اور اس وقت منصب کے عہدہ پر "صاحبانہ مسلک وخیال کے

ملنے تشریف لائے گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم و آزادی کی چلی۔ اکبر نے کہا، "ہم تو اپنے زمانہ میں آزاد خیال کا امام سید احمد خاں کو سمجھتے تھے۔ لیکن عورتوں کی آزادی انھیں بھی سخت ناپسند تھی"، وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے بات کاٹ کر بولے "سر سید کی رائے اس معاملے میں سخت قابل ترمیم تھی"۔ اکبر برجستہ بولے، "جی کیوں نہیں ایک اسی معاملے میں کیا خدا جانے کتنے معاملوں میں ان کی رائے قابل ترمیم تھی وہ خود قابل ترمیم تھے۔ دیکھئے نہ زمانہ نے انھیں ترمیم کر دی۔ وہ گذر گئے اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کر دیا"۔ یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اکبر کی حکیمانہ و ستارانہ اصلاح و تبلیغ کی۔ اس کی دھن ہر وقت سوار رہی۔ لیکن مجادلہ و مکابرہ کیا معنی نوبت رسمی مناظرہ و مباحثہ کی بھی نہیں آنے دیتے۔ اور خشونت ان کے لب و لہجہ کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شعر میں کہہ گئے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

انکار مذہبی بحث سے کیا ہے۔ بحث و مباحثہ کا رنگ کبھی آنے نہ دیا۔ باقی دھیمے دھیمے سروں میں میٹھے میٹھے بولوں میں مذہب کی تبلیغ تو چپکے چپکے ہر وقت کرتے رہتے۔ ایک دور مجھ پر الحاد کا گذرا ہے۔ خدا اور رسول تک کا منکر تھا۔ اسی زمانہ میں ایک روز باتوں ہی باتوں میں بولے "کیوں صاحب آپ نے کالج میں عربی میں بی لی تھی نہ؟ عرض کیا "جی ہاں" فرمایا تو پھر آپ قرآن کبھی آپ پڑھتے ہیں، مذہبی کتاب سمجھ کر نہ سہی۔ اس کی اعلی لٹریری حیثیت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا

سنتا ہوں جرمن یونیورسٹی میں ادب عربی کے کورس میں داخل ہے۔ کیا حرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لئے اسے کبھی کبھی پڑھتے رہئیے۔ آخر انگریزی بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی قید باوضو ہونے قبلہ رخ بیٹھنے کی نہیں۔ وضو بے وضو جب جاتے کچھ پڑھ لیا جیئے اور جو آیت پسند آجائے۔ اسے ذرا ایک دو بار دہرا لیا کیجئے۔ جیسے اچھا شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے ـــــ یہ تھا ایک نمونہ ان کی حکیمانہ تبلیغ کا۔ بحث و مناظرہ کے بغیر ہلکی پھلکی باتوں میں سب کچھ کہہ جاتے۔ ایک روز میرے اسی دور الحاد میں مجھ سے فرمانے لگے کہ "کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں کبھی شک ہوا ہے؟ خدا کی بات الگ رکھئے۔ صرف اتنا پوچھنا چاہوں کہ آپ بندے ہیں یا نہیں"؟ عرض کیا "جی ہاں کیوں نہیں اس میں تو شک ہوا نہیں" "بس پھر بیڑا پار ہے۔ اسی بندگی کا احساس کرتے رہیئے آپ کے لئے اس قدر کافی ہے۔ خدا کے عرفان کا دعوی کون کر سکتا ہے۔ جنہوں نے جانا ہے انھوں نے بھی کیا جانا ہے؟ میرا ایک شعر سن لیجئے۔

درد تو ہو جو ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

اپریل ۱۹۱۲ء کی وہ گھڑی اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں یوم وفات یہ دس برس اپنے تعلقات نیازمندی برابر قائم رہے۔ اور روز بروز بڑھتے گئے؛ اس مدت میں بہت کچھ سیکھا۔ بہت کچھ لیا۔ اکبر کے کلام سے اکبر کی ذات سے بھی، خوش نصیب تھا میں کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ ملا۔ بدنصیب تھا کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ اپنے عقائد کی

اصلاح ہیں۔ میں نے حضرت اکبر کے اثر کو چپکے غیر شعوری طور پر اور غیر محسوس طور پر کام کرتے ہوئے پایا وہ ابھی زندہ تھے کہ میں بحمدللہ مسلمان از سر نو بن چکا تھا۔ جب پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ عشرت منزل میں ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اس وقت ان کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کتنی بڑی دولت خود انھیں مل گئی ہے۔ توحید کے عاشق تھے۔ اور عشق کا ایک لازمہ غیرت ہے توحید کی غیرت اتنی تھی کہ کوئی دوسرا تذکرہ یہاں تک اللہ والوں اور اللہ کے پیاروں کا بھی زیادہ دیر تک سن ہی نہ سکتے۔ جھٹ موضوع بدل کر توحید پر آجاتے۔ اور آخر آخر تو فنا اور توحید یہی دو محبوب موضوع گفتگو رہ گئے تھے۔ آخر سنہ 1919ء سے میں نے مثنوی مولانا روم (کا نوری بخشی ایڈیشن) کا والہانہ مطالعہ شروع کیا۔ اور سنہ ۲۰ و سنہ ۲۱ء میں کہنا چاہیئے کہ یہی دھن ہر وقت اپنے اوپر سوار تھی اور میں مثنوی میں مست تھا۔ حضرت اکبر کی خدمت میں مثنوی کا ذکر چھیڑا۔ ایک بار پھر دوسری بار اور جب تیسری بار یہی نام میری زبان پر آیا تو حضرت تڑسے بولے " کیوں صاحب یہ فرمایئے اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم؟ میں نے کھسیانے ہو کر کہا کہ "اللہ میاں" بولے میں آپکی گفتگو سے یہ سمجھا تھا کہ شاید مولوی روم بڑے ہیں۔ جب سے آپ آئے ہیں بار بار انہیں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سنا۔ میں تو سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپ کی رہنمائی مثنوی تک کی ہے۔ یا مولوی روم آپ اللہ تک لے آئے ہیں؟" حد یہ ہے کہ ایک بار جب ذکر رسول چھڑا تو اسے بھی دو چار منٹ بعد اکبر نے یہ کہہ کر لپیٹ دیا کہ "جی ہاں ہمارے اللہ میاں کی خدمت

کا کیا کہنا۔ محمدؐ جیسا بے نظیر اور بے مثال بندہ پیدا کر دیا۔ یہ نمونہ تھا غلبہ توحید کا۔

اکبر بڑے بر گو تھے۔ اور بڑے زود گو۔ جو دیوان چھپ چکے ہیں۔ وہ تعداد میں ایک نہیں تین ہیں[۱] اور جو کلام اب تک نہیں چھپا ہے وہ سب چھاپ دیا جائے تو اگر پوری دو جلد ہی نہیں تو ڈیڑھ جلد ضرور ہی اور تیار ہو سکتی ہے۔ اکبر کا پیام تقریباً وہی تھا جو اقبال کا تھا۔ یعنی خودی اور خودداری کا سبق۔ مشرقی کو مشرقی اور مسلمان رہنے کی تلقین۔ راہیں الگ تھیں لیکن منزل دونوں کی ایک۔ ایک چہروں کو ہنساتا ہوا چلا۔ دوسرا دلوں کو گرماتا ہوا بڑھا۔ اکبر کی زندگی درحقیقت ایک سبق ہے کہ انسان ظرافت، زندہ دلی، دل لگی، خوش طبعی کی راہ سے بھی کیسی کیسی خدمتیں دین و ملت کی انجام دے سکتا ہے۔

---
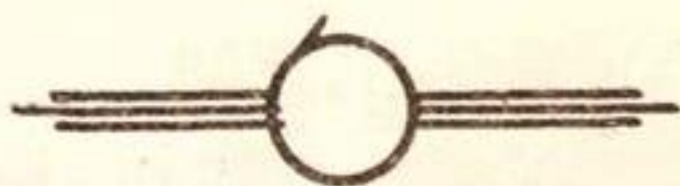
[۱] چوتھا دیوان بہت بعد کو نکلا۔

(۵)

دیباچہ خطوطِ اکبر[۱]

حضرت اکبر ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء اپنے زمانہ کے مشہور ترین شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ ساتھ ہی بڑے پختہ ایمان والے عارف باللہ۔ افسوس ہے کہ دنیا نے ان کو اس آخری حیثیت سے بالکل نہ جانا۔ بلکہ شاعری کی حد میں بھی انھیں صرف ظرافت کے نقیب کی حیثیت سے پہچانا۔ ہم جس حد تک اور جس حیثیت سے بھی انھیں جانا پہچانا۔ شہرت ان کے نام کی اور کلام کی خوب ہی ہوئی۔ آج سے ۲۵۔۳۰ سال اوپر کا انکا کلام گھر گھر پھیلا ہوا تھا۔ ہر پڑھے لکھے کی زبان پر ان کے دو چار شعر شوخی اور دل لگی کے ضرور تھے۔

مجھے شرف نیاز ۱۹۱۲ء میں حاصل ہوا۔ مہینہ غالباً اپریل تھا۔ میں بی اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الہ آباد گیا ہوا تھا۔ لکھنؤ اس وقت یونیورسٹی سے محروم تھا اور ڈگری کے امتحانوں کے لئے الہ آباد جانا

۱؎ ۱۹۴۶ء میں تاج کمپنی نے لاہور سے میری مرتب کی ہوئی خطوط مشاہیر جلد اول شائع کی۔ اس جلد کے تین حصوں میں سے حصہ دوم کا عنوان اکبر نامہ ہے اور یہ مجموعہ ہے حضرت اکبر کے تقریباً دو سو خط کا۔ یہ دیباچہ بھی اکبر نامہ پہ نومبر ۱۹۴۴ء میں قلمبند ہوا تھا۔

ہوتا تھا) وہیں حضرت اکبر کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی مرحوم کا سن ۶۶
سال کا تھا۔ شہرت کا آفتاب عروج کو پہونچا ہوا۔ اور میں اپنی عمر کے بیسویں
سال میں۔ سلسلہ مراسلت ایک سال بعد ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا۔ اور آخری
عمر تک برابر قائم رہا۔ کچھ خطوط ضائع بھی ہوگئے ہونگے۔ تقریباً دو سو محفوظ رہ
گئے۔ مدت مراسلت کوئی آٹھ نو سال رہی۔ ابتدائی مکاتبت کے وقت میں
فلسفی قسم کا دہری تھا۔ ۱۹۱۹ء سے خطوط کا رنگ بدلا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں حضرت
کی وفات کے وقت بحمد اللہ پورا مسلمان تھا۔ اس اصلاح حال میں کسی حد تک
دخل حضرت اکبر کی شخصیت و تعلیمات کو بھی ہے۔ تبلیغ بڑے مزے سے کرتے
رہتے۔ بیٹھے دل نشین اور موثر انداز میں۔ سننے والوں کو پتہ بھی نہ چلتا اور وہ
دین کی محبت یا وقعت دل میں بٹھاتے چلے جاتے۔ اس کے دلچسپ نمونے ان صفحات
میں کثرت سے اور بار بار ملیں گے۔ اکبر شاعر اور ظریف شاعر سے کہیں پہلے مومن و مومن گر تھے

اکبر نثر پر توجہ کرتے تو یقیناً ایک نامور ادیب ہوتے ان کے حسن
ادب اور ان کی شگفتہ نگاری کے نمونے ان اوراق میں شروع سے آخر تک
بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے سبک اور
نازک جملے، بات میں بات پیدا کرنا۔ طوالت ثقالت سے بچنا،
پیچیدہ ترکیبوں، ثقیل لفظوں سے احتیاط اور زبان کی صحت
اور بیان کی شستگی، صفائی، روانی، سلاست یہ سب ان کے
قلم کے خاص جوہر ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ باتیں سطحی نہیں گہری۔
مطالب کی بلندی، خیالات کا عمق۔ اکبر بڑے ادیب ہی نہیں اچھے
خاصے مفکر و فلسفی بھی تھے۔ مشرقی اور مغربی فلسفہ پر نظر
رکھنے والے۔ اکبر پڑھتے کم تھے سوچتے زیادہ تھے۔ دوسروں

کے خیالات جذب کم کرتے۔ خود انھیں کے خیالات ابلتے
زیادہ رہتے تھے۔ فلسفہ خوان، فلسفہ دان کم تھے۔ دانش آموز
حکمت آفریں زیادہ تھے۔ اور ان کی ذہانت بے پناہ تھی اگلے
صفحات ان سب کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

معاصرت کا ابتلا بھی عجیب ہوتا ہے۔ بعض نامور معاصرین
پر چبھتی ہوں اور ایک یا دو جگہ دل کو دکھ پہنچانے والی رائے
زنی جو ملے گی وہ خاص حالات اور خاص ماحول کا نتیجہ تھی۔ اور اب
بالکل قابل معافی ہے۔ خطوط کے پڑھنے والے اسے شروع
ہی سے ذہن نشین کریں

محرومی و بد نصیبی اپنی یہ کہ ایسے شفیق اور محترم بزرگ
کا سایہ عاطفت لتنے دنوں تک نصیب رہا۔ لیکن نہ ان کے
ظاہری کمالات ہی سے استفادہ کیا۔ اور نہ ان کی خدمت ہی
کا حق ادا کیا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

(۵۱)

نائیہ کی موت[۱]
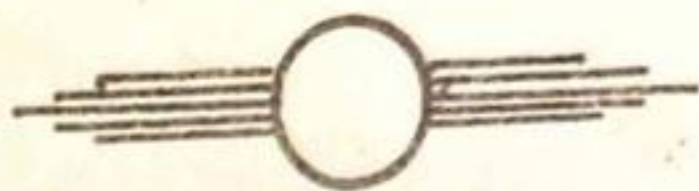
کلیات اکبر حصہ اول اگر موجود ہو تو سامنے کھول کر رکھئے طبع چہارم ۱۹۱۴ء کے صہ ۲۰۸ و صہ ۲۰۹ پر ایک فارسی قطعہ تاریخ تعزیت میں ملے گا۔ (اکبر کبھی کبھی فارسی بھی کہہ لیا کرتے تھے)۔ وفات کسی نو عمر و نوخیز حسین خاتون کی ہوئی تھی ؎

آں نونہال خوبی، ماہ دو ہفتہ من   در نو بہار عمرش رفت از قضائے ہستی

باقی گیارہ سطروں میں ذکر اسی مرحومہ کے حسن و جمال اور محبوبیت کا ہے۔ مقطع ہے ؎

تاریخ فوت گفتیم در سخنے عجیب   بوٹا بُردی شد اکبر از گرد باغ ہستی

بوٹا نام تھا ــــ کلیات میں سرسری اچٹتی نظر بارہا اس قطعہ پر پڑی تھی۔ ابکی جو الہ آباد جانا ہوا تو مزار اکبر جا کر، اکبر کے خاندانی قبرستان میں چل کر یہ راز بھی حل ہوگیا۔

نگاہ آج سے سترہ سال قبل پھسکنے نظر کے سامنے اس وقت کا مسلمانی تمدن اور کھاتے پیتے مسلمان گھرانوں کی معاشرت لئے گئے۔ بعد

---

[۱] صدق لکھنؤ ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء میں "سچی باتیں" کے عنوان سے

کے ممتاز شاعر و حکیم اور معارف حضرت اکبر اس وقت محض ایک کامیاب وکیل، میر اکبر حسین ہیں۔ مست شباب سال ولادت ۱۸۴۶ء تا ۱۸۷۵ء وہ تیس سال کے تو ہوتے۔ ہر دور میں لغزش سے کامل احتیاط کا دعویٰ اچھے اچھے صالحین کے لئے بہ مشکل کیا جا سکتا ہے۔ اور معصوم ذات تو صرف انبیاء کی ہوتی ہے، تو یہ بیچارے تو ایک جوان ہے۔ زندہ جذبات رکھنے والے وکیل ہی تھے۔ شہر کی ایک بالکل کم سن چھوکری کل ۱۲ یا ۱۳ ½ سال کی عمر کی لڑکی صورت و شکل میں بہت ممتاز بوٹا جان رشک حسیناں جہاں حسن اور عصمت فروشی کی دوکان پر لاکر بٹھائی جاتی ہے۔ نظر میر اکبر حسین اکبر سے چار ہوتی اور نفس نفس کی جانب کھنچتا ہے۔ اب آگے دیکھئے شیطان کس طرف ڈھکیلتا ہے۔ اور خیر الماکرین کی حکمت و مشیت کدھر لیجانا چاہتی ہے؟ — عین اپنی کم سنی کی بہار اور تندرستی کے شباب میں شیطان کی سہیلی بیمار اور سخت بیمار پڑ جاتی ہے۔ معاً وہی قدم جو آگ کے ہولناک گڑھے کی طرف اٹھ رہے تھے گلشن جنت کی گل و گلزاری شاہراہ پر پڑنے لگتے ہیں۔

مریضہ کو یقین مرض الموت ہو جاتا ہے۔ اور مسلمان گھرانے کی پیدائش رنگ لاتی ہے۔ خواہش نکاح کی پیش کرتی ہے اور عین اس کے مرض الموت کے بستر پر جب نفس کی لذتوں کا کوئی بھی لگاؤ نکاح میں باقی نہیں رہ جاتا وہ، وہ سید اور سید زادہ اسے اپنے عقد زوجیت میں باقاعدہ لے آتا ہے۔ شہر کے ایک جنتی بزرگ کے ہاتھ پر کمسن مرنہ توبہ کرتی ہے۔ بیعت کرتی ہے اور گناہوں سے دھلی۔

دھلا پاک و صاف، کلمہ توحید پڑھتی ہوئی جولائی ۱۸۷۶ء مطابق شوال ۱۲۹۳ھ میں جنت کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ سر پر جو طویل کتبہ درج ہے اس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمۂ شہادت اور آیۂ کریمہ "کل شئ من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام" کے بعد یہ تصریح بھی درج ہے کہ ہر کلمہ توحید جان بحق تسلیم کرد۔ توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے جان دی۔ اللہ اللہ — ساری ریاضتیں اور سارے مجاہدے اس دن اور اس گھڑی کے لئے تو ہوتے ہیں۔ جس بندہ اور جس بندی کو وہ جس مرتبہ پر چاہیں پہونچا دیں! کسی کے بھی ایمان کی تحقیر کا حق کسی کو حاصل ہے؟۔

(۸)

۲۵ ویں برسی

ایک مختصر سی لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ لکھنؤ میں آج

سلہ نشری تقریر لکھنؤ ریڈیو سے ۹ ستمبر ۱۹۴۶ء کو وقت ۱۰ منٹ حضرت اکبر کی وفات ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔ اور ان کی پچیسویں برسی تھی۔ یادر سال ولادت ۱۸۴۶ء تھا۔ اس حساب سے ان کی ولادت کی ایک صدی سالگرہ بھی ہوگئی۔

سے کوئی پچاس سال قبل آراستہ ہے۔ مصرع طرح کی زمین ہے۔ "ازل ہی
"کل سے" ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ؎

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ کلام میں بانکپن تھا
ہی اس غضب کا اور اس شعر پر تو محفل لوٹ لوٹ گئی ؎

ان کی مست ہے لبریز معانی   ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے۔ اور شراب سے اسے
تشبیہ بار بار دی جا چکی ہے۔ حافظ کی غزل تک اس کا رتبہ پہونچا دینا
یہ اسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ ہے۔ اور عجب کیا جو خود خواجہ حافظ
کی لاج بھی اچھوتی داد سن کر وجد میں آ گئی ہو۔ اور پھر جب اس شعر کی
نوبت آئی ؎

حکم آیا جو خموشی کا تو بس حشر تلک چپ   ہمت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

تو جو اہل دل تھے ان کی آنکھوں سے چھلک آئے۔ اور اہل معرفت
کی زبان پر بے ساختہ مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے جاری ہو گئے۔
لیکن شاعر نے جب اپنی اس غزل کے ایک شعر کا جب یہ مصرعہ پڑھا کہ

قرآن شاہد ہے کہ خدا حسن سے خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے گہرے مذہبی شخص خان بہادر منشی اطہر علی
کاکوروی موجود تھے۔ ان کے تیور پر کچھ بل سے پڑنے لگے کہ یہ لیجئے قرآن
سے بھی شوخی ہونے لگی۔ اور شاعر اپنی حد سے بڑھ چلا۔ حساس شاعر تھا
تاڑ گیا اور جھٹ پہلے مصرعہ کی تکرار کر پورا شعر یوں سنایا ؎

—

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی اور خان بہادر نے تو بے اختیار اٹھ کر گلے لگا لیا۔ ان شاعر کو آپ نے پہچان لیا۔ یہی تھے سید اکبر حسین اکبر۔ اس وقت غالباً منصفی کے عہدہ پر تھے۔ آگے چل کر خفیفہ کے جج اور پھر سیشن جج ہوئے جو اس زمانے کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی "ترقی" کی گویا معراج تھی۔ خان بہادر ہوئے الٰہ آباد یونی ورسٹی کے فیلو ہوئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیات کی تین چار جلدوں[۱] کے مصنف، اپنے وقت کے نامور ترین شاعر بھی ہوئے اپنے رنگ میں فرد برجستگی اور بدیہہ گوئی کے شاعر تھے۔ ایک نمونہ تو ابھی سن ہی چکے اور معنی آفرینی گویا ان کا حصہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جب حسن مضمون کو چاہا بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت ہم کو آپ کو کچھ نہ وقت لینا ہی پڑتا ہے انھیں شعر کہتے بھی اتنی دیر نہ لگتی اسی نیاز مند کو مرحوم کے عمر کے آخری نو دس سال ذاتی نیاز مندی اور حضوری کا اچھا خاصہ اتفاق رہا یہ بات اندھی عقیدت کی راہ سے نہیں۔ اس ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کی جا رہی ہے۔ حضرت اکبر بوڑھے ہو چکے تھے۔ عمر ۶۴۔ ۶۵ سے زائد ہو چکی

---

[۱] ۔ تین جلدیں تو زندگی میں ہی چھپ چکی تھیں۔ چوتھی وفات کے مدتوں بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔

تھی۔ ذہانت شوخی، برجستگی، معنی آفرینی، لطافت زبان حسن بیان، یہ سب اوصاف اس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرنے، اور بعض دفعہ بے بات کی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود ہنستے بھی بہت کم تھے۔ دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ رہتے۔ اور ہنساتے ہنساتے کبھی رلانے لگتے۔ کوئی چوٹ ایسی دل پر لگا دیتے کہ سننے والے کا دل رو سے بھر آتا ہے۔ راگوں میں سنا ہے کہ کوئی دیپ راگ بھی ہوتا ہے جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے۔

پر گوئی گویا ان پر ختم تھی۔ تین کلیات تو صرف چھپے ہوئے باقی جتنا حصہ چھپنے سے رہ گیا ہے وہ بھی ایک کلیات یا ڈیڑھ کلیات سے کم نہیں۔ اور وہ شعر جو اکبر "سخن گو" نے کہے اور اکبر سخن سنج کو چھپنے کے قابل نظر نہ آئے۔ ان کی تعداد ان کے علاوہ۔ اصل ناموری غزل گوئی میں نہیں، نظم گوئی میں پائی۔ اس کی بھی ایک خاص صنف یعنی مزاحیہ نگاری میں لیکن غزلیں بھی جناب اکبر کی کسی سے کم نہیں۔ کم نہ تعداد حجم کے لحاظ سے اور نہ حسن و محبوبیت کے اعتبار سے — ۱۰ منٹ کی مہلت میں اتنی گنجائش ہی کہاں ورنہ اکبر کے عاشقانہ کلام کثرت سے نمونے پیش کر کر کے فیصلہ خود آپ ہی کے ذوق سلیم پر چھوڑ دیا جاتا

اکبر مذہب کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرفداروں میں تھے۔ اور یہ بات یاد رہے کہ وہ وقت تھا جب "رفارم" یا اصلاح و تجدد کا جھنڈا سید احمد خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر ان کے معاصر تھے۔ گو سن میں کہیں ان سے چھوٹے اور علی گڑھ میں خود مصنف رہ کر "رفارم" یا تجدد کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے

—

تھے۔ کلام میں خوب ہی خوب چٹکیاں لیتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ چٹکیاں بھی
عموماً گدگدی کے رنگ میں ہوتی ہیں ــــ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے وہ مجھ سے "دین کی اصلاح فرض ہے" میں چل دیا کہ یہ کہہ کر آداب عرض

کہیں کہیں یہ ظرافت ہلکی سی نشتریت بھی پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے
یہ شعر ؎

سید اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

گزٹ کے معنی سرکاری گزٹ کے تو بالکل ظاہر ہے۔ ایک تلمیح یہ بھی ہے
کہ سر سید کے ہفتہ وار اخبار کا نام بھی علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا۔ یہ
شعر ایک غزل کا ہے اور غزل کا مطلع ہے ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

یہاں تک جب آگئے ہیں تو ایک آدھ شعر اور بھی اس غزل کا ہو جائے
تو کیا مضائقہ ہے ؎

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش طالب زمزمہ بلبل شیدا نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس ایک سر بھی اسے آمادہ سودا نہ ملا

اور ایک شعر مخصوص اکبری رنگ کا ؎

واہ کیا راہ دکھائی ہمیں مرشد نے کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

سیاسیات میں اکبر کا مذاق وہی تھا جو ہر خوددار مشرقی کا
ہونا چاہیے۔ لیکن یہ میدان کے سپاہی اور اکھاڑے کے ڈنڈ پیل پہلوان
نہ تھے۔ مجلس ادب کے سند نشین اور بزم ظرافت کے بید تھے۔ زبان کھولتے تو میٹھے

میٹھے بولوں میں ایک پھلجھڑے چھوڑ جاتے۔ ہنسی کی کھلکھلاہٹ سننے والوں
کی پیشانیوں پر شکن قائم ہی نہ رہنے دیتی ایک رباعی کے پہلے مصرعہ میں فرماتے ہیں ؎

انگریز ہر اک فن میں ممتاز بھی ہیں

دوسرے مصرعہ کے کچھ لفظ بھول رہا ہوں "دمساز بھی ہیں" کچھ اس طرح
باندھا تھا۔ خیر جانے دیجیے[۱] کام کے مصرعہ آخر کے ہیں ؎

بابو کو سجا دیا جو چال دے کر   اس سے یہ کھلا کہ دلگی باز بھی ہیں

یہ بابو کیا خوب۔ ایک طرف بنگالی ہی نہیں بلکہ انگریزی داں
ہندوستانی اور دوسری طرف دکانوں پر بکنے والے چینی کے کھلونے
کل سے ناچنے والے، اور حالی کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں کھلا
تو بہت ہی خوب "یہ چابی" سے کھلنا عجب نہیں۔ بڑے بڑے استادوں کو
بند کردے۔

اکبر ذاتی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہر بڑے
چھوٹے سے جھک کر ملنے والے کسی کی دل شکنی نہ گوارا کرنے والے اور
نماز و قرآن کے گویا عاشق۔ ایسا عشق جو اچھے اچھے عالموں، درویشوں
میں بھی کم تر دیکھنے میں آیا ہے۔ آج ۹ ستمبر کو ان کی بچیسویں برسی
ہے۔ فاتحہ خیر پر اس ذکر کو ختم کیجیے۔

---

[۱] بعد کو پروفیسر تعلیم الرحمن صاحب ایم اے الہ آباد یونی ورسٹی
کی عنایت سے یہ دونوں صحیح مصرعہ بھی معلوم ہو گئے ؎

انگریز قوی بھی ہیں سرافراز بھی ہیں   تدبیری علم و فن میں ممتاز بھی ہیں

(۹) (۸)

گاندھی نامہ[1]

حضرت اکبر اردو زبان کے مایہ ناز اور مشہور و معروف شاعر حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام کا ایک مختصر سا تازہ مجموعہ آج جمعہ ۱۴؍ مئی ۱۹۴۸ء کو ہی موصول ہوا۔ کوئی خیال بھی کر سکتا تھا کہ حضرت اکبر جن کی وفات کا سال ۱۹۲۱ء ہے۔ ان کا کوئی غیر مطبوعہ کلام پہلی بار ۱۹۴۸ء میں جاکر شائع ہو گا۔ جبکہ ان کے فرزند بھی دنیا سے رخصت ہو چکے اور جب خود ان کا نام لوگ بھول چکے۔ قدرت کے عجائب بھی ایک سے بڑھ کر ایک عجیب ہوتے ہیں۔ اور پھر حضرت اکبر تو ندرت بیان اور بداعت اسلوب کے مشہور تھے۔ اس میں عجیب کیا کہ نظام تکوینی نے خود ان کے کلام کی طبع و اشاعت سے متعلق ندرت و بدعت کا یہ پہلو ملحوظ رکھا۔

مبارکباد کے قابل ہیں سید مسلم رضوی (عشرت منزل الہ آباد)[2] جنہوں نے اپنے نامور دادا جان کے اس صحیفۂ ادب کو گمنامی اور بے

لہ ۔ صدق ۱۱؍ جون ۱۹۴۸ء

سلہ یہ پتہ قیام پاکستان سے قبل کا تھا۔

نشانی سے نکالا۔ اور ان سے بھی بڑھ کر قابل مبارکباد ہیں الٰہ آباد یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر تعلیم الرحمٰن ایم اے جنہوں نے محنت و تعب برداشت کرکے اس نسخہ گم فراموش کے جزدان سے باہر نکالا، گرد جھاڑی اور اپنے مقدمہ (تمہید) و تحشی کے بعد اسے بازار میں لا رکھا۔ ملنے کا پتہ کتابستان الہ آباد قیمت ؏ مجلد مع تصویر حضرت اکبر ضخامت ۴۴ + ۱۲ - ۶۱۱ صفحات

گاندھی نامہ میں کل اشعار حسب تصریح مرتب ۳۷۲ ہیں لیکن سب کی نہ صنف ایک نہ وزن ہی ایک۔ کچھ قطعات ہیں۔ کچھ رباعیاں ہیں۔ کچھ محض فرد۔ شاعر نے محض اشتراک معنوی یا مناسبت مضمون کی بنا پر ایک مجموعہ میں داخل کر دیا ہے۔ اور نہ یہ سارا مجموعہ ایک وقت میں یا مسلسل کہا گیا ہے۔ کوئی شعر کبھی کہا گیا اور کوئی کبھی اس لئے کلام کے مختلف اجزا میں باہمی ربط ہر جگہ نمایاں نہیں کہیں کہیں خفیف ہے اور کہیں کہیں مخفی۔ البتہ جو کچھ کہا گیا ہے سب وسط ۱۹۱۹ء سے لیکر وسط ۱۹۲۱ء یعنی شاعر کی وفات سے ذرا قبل تک۔ اس کلام سے لطف اٹھانے بلکہ اسے پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ بطور پس منظر ہندوستان کے ہیجان سیاسی کا نقشہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء کا پیش نظر ہو۔ اور جس کے سامنے یہ نہیں وہ خود فاضل مرتب کی طرح ہزار خوش فہم ہو پھر بھی ٹھوکر پر ٹھوکر کھائے گا۔ صحیح واقعاتی واقفیت کی کمی یا تلافی نہ ذہانت سے ہو سکتی ہے

لہ افسوس ہے کہ ان سطور کی اشاعت سے بہت قبل مرحوم ہو چکے تھے

نہ عقیدت سے اور نہ کسی ناقص اور ضعیف قسم کے راوی کے بیانات
پر اعتماد کر لینے سے۔

اصل کتاب کی ضخامت کل ۶۱ صفحے کی ہے۔ ۱۲ صفحوں میں بڑے
گاندھی نامہ کا نقش اول، ایک چھوٹا سا گاندھی نامہ (اسے "گاندھی نامچہ"
کہیے تو کیا بیجا ہے۔ کل ۶۲ شعروں کا ہے اور اس سے قبل مرتب صاحب
کی دلچسپ تمہید ۱۴ صفحوں کی ہے۔ کتاب کے سارے کے سارے اشعار
اب تک غیر مطبوعہ نہ تھے۔ متعدد اشعار یہ راقم اثم حضرت اکبر کی بیاض
سے اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں (جب وہ پرتاب گڈھ میں اپنے صاحبزادہ کے ہاں مقیم
تھے) نقل کر لایا اور اسی زمانہ میں رسالہ معارف (اعظم گڈھ) میں انہیں
شائع بھی کرا دیا اور ایک قطعہ (نئی روشنی کا ہوا تیل کم صفحہ ۲۹ نمبر ۸۷ کا
بھی اسی زمانہ میں چھپ جانا اچھی طرح یاد ہے۔ خیال ایسا پڑتا ہے کہ
بدایوں کے ماہنامہ نقیب میں نکلا تھا ـــــ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کا
ارادہ کسی ایک رسالہ کے مرتب کا تھا نہیں۔ بس جب ایک عرصہ کے بعد
خاص اس موضوع کے متعلق اتنا کلام ہو گیا۔ تو ایک مستقل عنوان
دے کر یکجا کرنے کا خیال آیا سنہ ۱۹۱۹ء و سنہ ۲۰ء و سنہ ۲۱ء میں یہ نیاز
مند برابر حاضر خدمت ہوتا رہا۔ اور گرامی ناموں سے بھی برابر شرف
ہوتا رہا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس رسالہ کا ذکر فرمایا ہو۔ سب
سے پہلے اس کا ذکر جولائی سنہ ۲۱ء میں فرمایا اور آہ کہ وہی آخری ملاقات
تھی قیاس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس سارے کلام کو یعنی جو کچھ
بھی گاندھی جی اور ان کی تحریک ترک موالات وغیرہ کے سلسلہ میں
تھا۔ یکجا کر دینے کا خیال آیا تھا۔ بہر حال سنہ ۲۰ء بلکہ اغلبًا سنہ ۲۱ء کا

مرتب کیا ہوا رسالہ اس وقت سے اب تک یوں ہی مسودہ کی شکل میں پڑا رہا۔ اور شائع اب جاکر ہوا۔ جب نہ خود گاندھی جی باقی رہے نہ تحریک خلافت، نہ تحریک ترک موالات اور نہ خود وحید لیم وظریف شاعر! کتاب کے نقشے جا بجا اب بھی بہت دلچسپ ہیں۔ اور کیوں نہ ہوتے کلام بہر حال اکبر کا کلام ہے۔ لیکن پورا لطف صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو آج سے ایک ربع صدی قبل کی تلمیحوں سے پوری طرح واقف ہوں اور تو اور خود حضرت مرتب بہ ایں فضل وخوش فہمی پوری واقفیت نہ ہونے کے باعث بار بار دھوکا کھا گئے ہیں قطعہ ع ۱۰۳ یوں درج ہے ؎

پالٹکس جھگڑے چھوڑو	ان باتوں سے اب منہ موڑو
کیسے ڈائر کیسے ہنٹر	لا دب عزم لاؤ کنٹر

اس پر مرتب کا حاشیہ ڈائر تو تقریباً صحیح[ل] ہے کہ ڈائر لاہور کے فوجی افسر کا نام تھا۔ لیکن ہنٹر پر وہ صرف اس قدر لکھ کر رہ گئے کہ ہنٹر ایک فرضی نام معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہر لوگوں میں یہ نام عام ہے۔

حالانکہ ہنٹر اسی مشہور انگریز بیرسٹر کا نام ہے جو اس تحقیقاتی کمیشن کا صدر تھا۔ جو ڈائر شاہی مظالم کی تحقیق کے لئے مقرر ہوا تھا۔ جو ۱۹۲۰ء کے اخبارات کی فائیلیں اٹھا کر دیکھی جائیں تو کالم کے

ل تقریباً صحیح اس لئے ہے کہ جنرل ڈائر صرف لاہور کا نہیں صوبہ پنجاب کا سب سے بڑا فوجی افسر تھا۔

کالم ہنٹر کمیشن کی یہ کارروائیوں سے بہر نظر آئیں گے

صفحہ ۱۵۶ پر ذیل کا قطعہ نمبر ۱۴۱ ہے کہ

طب دہلی کی مدد سے بت کی صحت بڑھ گئی۔
قدرت باری سے منجانہ کی شوکت بڑھ گئی
ڈائروت جب شیخ صاحب نے بجی کی بیش صنم
گاندھی آندھی ہو گئے چیلوں کی ہمت بڑھ گئی
آکسن بھائی نے قربانی تعصب کی ہو کی
جان بل چپ ہو گئے گائوں کی قیمت بڑھ گئی

اس کا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جو اس سے واقف ہیں کہ ترک موالات کی طوفانی تحریک میں "طب دہلی" (حکیم اجمل خاں مرحوم) اور "قدرت باری" (مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم) اور "شوکت" (مولانا شوکت علی مرحوم) اور آکسن بھائی[1] (مولانا محمد علی "اکسن مرحوم) کے کیا کیا مرتبے تھے۔ اور پھر "آکسن" و "قربانی" اور جان اور "گائے" کی باہمی مناسبتیں!

صفحہ ۱۵۷ پر ایک قطعہ عدد ۱۷۲ ہے :-

حضرت گاندھی پھرے ہیں شملہ پر نور سے
واپسی موسیٰ کی یاد آئی کوہ طور سے
مشتہر اخبار میں کر دیں اسی مضمون کو گوج
اور بندوں کو بھی حاصل ہونے والا ہے عروج

اس کے مصرعے سوم کے لفظ "گوج" پر جناب مرتب کا حاشیہ ہے کہ

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

؎ یہ لفظ یوں ہی لکھا ہے ـــ معنی ؎۲ معنی بہت آسان تھے
مسٹر گوج صوبہ کے ایک بڑے انگریز حاکم کا نام تھا۔ جو ۱۹۲۱ء میں
صوبہ کا پولیٹیکل کمشنر تھا۔ اور خود جناب مرتب نے بھی تمہید میں یہی
لکھا ہے ـــ گاندھی جی ۲۱ء میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی
دعوت پر شملہ ان سے ملنے گئے تھے۔ اور وہاں سے پلٹ کر علی مراد
اور ان کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی آتشی زبان سے معافی مانگ لیں۔ اس
معذرت کو سرکاری اور نیم سرکاری اخباروں نے خوب اچھالا تھا۔ قطعہ
میں تلمیح انہیں واقعات کی جانب ہے۔

کابل کی تلمیح بار بار آتی ہے ـــ مثال ۱۷۷ میں یہ مصرعہ کہ

کابل کے بل سے گائے جو بھڑکے کیا کریں

یا ۱۸۲ میں مالوی جی کے متعلق کہ ؎

وہ بولے کہ کابل سے ہوگا گزند ۔۔۔ کریں گے ہم انگریز ہی کو پسند

تو ایسے اشعار میں صاف اشارہ اس طرف ہے کہ ہندو لیڈروں
(مالوی جی وغیرہ) نے حکومت کی شہ پاکر بدگمانی یہ ظاہر کی تھی یہ علی برادران
اور دوسرے مسلمان لیڈر تو ہندوستان پر افغانستان کی حکومت قائم کرا
دینے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں۔ اور پھر ادھر ۱۹۱۹ء میں جنرل نادر خان
مرحوم (جو بعد کو نادر شاہ فرمانروائے افغانستان ہوئے) کے ہاتھوں
مقام تھل (Thal) برطانیہ کو افغانی فوج سے اپنی توقع اندازہ کے بالکل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آکسن کے انگریزی میں دو املے ہیں۔ ایک املے سے اس کے معنی "آکسنرڈ کے بڑھے ہوئے کے ہیں اور دوسرے املے سے وہ آکس (بیل) کی جمع ہے۔

خلاف ایک سخت شکست بھی اٹھانی پڑی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں مصرعہ بسر تسلیم خم ہے جو مزاج جارج میں آئے "کے لفظ جارج پر حاشیہ ہے کہ جارج پنجم یا داورِ ششم شاہ انگلستان" اس عبارت میں "یا ششم" کا اضافہ محض حشو ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جارج ششم کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف جارج پنجم ہی مراد ہیں۔ ولی عہد کا نام ایڈورڈ ہے۔ تمہید اور قابل قدر تمہیدی دو باتیں کلام اکبر کے سلسلہ میں کتاب بزم اکبر[1] کے حوالہ سے اور کہی گئی ہیں اور دونوں محتاج تصحیح ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ حضرت اکبر نے انگریزی لفظ پریس کو (مطبع) کو اردو "کسی" کا ہم وزن باندھا ہے۔ اور جب ان سے اس کی بابت سوال کیا گیا تو بہت بگڑ کر جواب دیا "من گفتم و محاورہ شد"۔ بہت بگڑنے کی روایت کی تحقیق نواب حضرت اکبر کی وفات کے بعد ہونی محال ہے۔ البتہ یہ سوال تو بہت کھلا ہوا ہے کہ "پریس" کو آخر کہاں انھوں نے کس کا ہم وزن باندھا ہے۔ کم از کم اس شعر میں تو ہرگز نہیں جس کا حوالہ درج ہے یعنی۔

علوم ان کے زباں ان کی پریس ان کے لغات ان کے
ہمارے زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات ان کے

دوسری بات "اسی" "بزم اکبر" کے حوالے سے یہ فرمائی گئی ہے کہ اکبر کے مشہور شعر ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں | گو خاک راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں[2]

---

[1] مصنفہ ماسٹر قمر الدین بدایونی [2] مجھے دوسرا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں، بدھو میاں سے اشارہ مولانا محمد علی ان کی شخصیت وذات سے متعلق سمجھے ـــــ اس خاکسار سے بڑھ کر مولانا محمد علی رح اور حضرت اکبر کا نیازمند اور عقیدت مند کیش کون رہا ہوگا۔ میرے علم میں یہ بات پہلی بار آرہی ہے۔ ورنہ اس کے قبل تو جب سنا تھا یہی سنا تھا کہ یہ اشارہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہی کی جانب ہے اور اسی شہرت عام کے بعد بطور تلافی حضرت اکبر نے یہ شعر بھی ارشاد کیا تھا ؎

اے چرخ ہوائے شوخ چلے اے شاخ عمل گلباری کی
کچھ کام کریں کچھ سعی کریں، ہر شیخ کو عبدالباری کر
گاندھی نامچہ کے متعلق تمہید میں ہے کہ

اور چھوٹا سا نسخہ جس انداز سے شروع ہوتا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف کسی خاص رسالہ یا اخبار کے ایڈیٹر سے مخاطب ہیں۔ افسوس ہے کہ اس مخطوط ہی کہیں کوئی تحریر ایسی نہیں کہ جس سے معلوم ہوسکتا کہ یہ خطاب کن ایڈیٹر صاحب سے ہے۔ حضرت اکبر کی جس عبارت کا حوالہ ہے وہ اصل میں یوں ہے۔

" جناب ایڈیٹر صاحب۔ دو چار روز سے آپ کے ایڈیٹوریل فتنہ موجود کے متعلق بہت معنی خیز ہوتے ہیں۔ آپ صحیح فرماتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کی نسبت خیالات متحد نہیں ہیں۔ ایک طرف کہا جاتا

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) مصرعہ یوں یاد پڑتا ہے ع
اک مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

ہے کہ افغانستان کا حملہ ہوگا۔ اگر انگریز چلے جائیں گے۔ دو چار روز سے آپ کے ایڈیٹوریل اس ٹکڑے صاف کر دیا کہ کوئی رسالہ یا ہفتہ وار نہیں بلکہ کوئی روزنامہ ہی مراد ہے۔ اور روز پابندی کے ساتھ حرف لکھنؤ کا ہمدم حضرت اکبر کی نظر سے گذرتا تھا۔ اور ایڈیٹر ہمدم سید جالب دہلوی سے حضرت اکبر کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔

اکبر کا یہ پر لطف شعر بھی ہمدم کی شان میں یاد کر لیجئے ؎

ہے نام اس کا گر ہمدم رہے
دم نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے

جالب صاحب گاندھی جی کے معاملہ میں حضرت اکبر کے ہم خیال تھے۔ یعنی معتدل درجہ اور نرم لہجہ میں تحریکات کے مخالف۔ شاعر کا مکتوب انھیں جالب صاحب ایڈیٹر ہمدم کے نام ہے۔

اب اصل کلام پر ایک سرسری نظر کر لیجئے۔ کلام اتنا پرانا ہو جانے کے بعد بھی باسی نہیں ہوا ہے۔ بلکہ بعض اجزا ر بدستور تازہ و شگفتہ ہیں ــــ اور کہیں کہیں تو جیسے کوئی مصرعہ الہام سے زبان پر آ گیا ؎

گائیں اچھل رہی ہیں   قصائی اداس ہیں

حیرت ہوتی ہے کہ یہ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء کا چہرہ ۱۹۶۰ء و ۱۹۶۱ء کے آئینہ میں کیسے نظر آ گیا تھا۔ شعر یہ ہوا ہے ؎

ٹھونکے تھے مردمیداں ہی بیٹھ   اب روایتی ہر جے ہونے لگی

اور یہ طرز بیان تو خاص اکبر کا حصہ ہے ؎

دہی جگہ ہر اک کا ارمان نکل رہا ہے   تو ہیں بھی چل رہی ہیں جوتا بھی چل رہا ہے

لیکن رہا میں چپ کا دل ہیں یہ بات سوچی   کسی تقوبت پر اٹھوں انجینئر یہ سوچی

اکبر جس طرح انگریزیت اور صاحبیت سے بیزار تھے۔ اسی طرح تہذویت سے بھی ڈرتے رہتے تھے ؎

تمہاری چال راہ کفر سے کس دن الگ دیکھی
جو ظلم گرگ ان میں ہے تو حرص وسگ دیکھی

علی برادران کے اخلاص کے بہت قائل تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی ڈرتے جاتے تھے کہ کہیں یہ خدمت دین سے دور نہ جا پڑیں۔

دشواری بہت ہے مستحق آئر ہونا کچھ کھیل نہیں علی برادر ہونا
ہاں سب یہ دعا کریں کہ ان بندوں کو آسان ہو پیمبر ہونا

شوخی وظرافت کی پھلجھڑی بھی چھوڑے جاتے ہیں لیکن ادھر وقت آیا۔ اور ادھر اذان بھی پکار دیتے ہیں ؎

ہے چھتری بھی جب نہ پتلا ہے نہ ہاکی ہے   پوری بھی خشک لب ہے کہ جھی حچھ چھٹانک ہے
کپڑا اگر ان ہے ستر ہے عورت کا انکار   کچھ بھی نہیں زبان پہ فقط ڈھانگ ڈھانک ہے
کھگوان گرم ہو سودیش کے بیل پر   لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی مانگ ہے
اکبر یہ ہار ہے یہ تماشائے دل شکن   اسکی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

ظاہری طمطراق، پر زور لفاظیوں اور لطیفانہ کن ترانیوں کے وہ بالکل قائل نہیں ؎

رفیق شیطان بہک گئے ہیں آدم رپٹ گئے ہیں
سنا ہیں کیا تم کو قول فیصل کہ طور کر کے کھا گئے ہیں
ہمارا چلنا وہ رینگنا ہے جو کچھوے بھی نہیں تو بجا ہے
مگر زبان پر وہ مزہ زمزم ہے کہ سن کے بلبل بھڑک گئے ہیں

ہنسانے اور رلانے دونوں میں یہ قطعہ اپنا نظیر آپ ہے۔

نئی روشنی کا ہوا تیل کم — حکومت نے اس سے کیا میلا کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے — نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے — سیاسی کمیٹی میں پل جائیے
اس میل کا آج کل ہے ظہور — خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

مولانا شوکت علی مرحوم کی سیاسی زندگی وسرمستی اور ڈاکٹر ضیاء الدین کی وفاداری دونوں اگر نظر میں ہوں اور ساتھ ہی ساتھ دونوں کی مشترک اسلامیت پر بھی اگر نگاہ ہو تو البتہ اس شعر کا پورا لطف آئے گا ؎

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع وخو میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں ہیں اور یہ زو میں ہیں[1]

تحریک ترک موالات کے زیادہ اخلاص سے کبھی قائل نہ تھے سمجھتے تھے کہ یہ تو الگ طرح پر ہے گورنمنٹ کی عین حمایت ہے کہتے ہیں اور کیاشن کی تبلیغ گوئی پر کس طرح شکر لپیٹ کر کہتے ہیں ؎

آگئے تمہارے رنگ کسی کا نہیں جما — جے ہو تمہاری اے میرے گاندھی مہاتما
لینے کے تم نہیں ہو گورنمنٹ کی مدد — چوروں کو کیا ضرورت ہے پیرمنٹ کی مدد

اپنی علیحدگی بے تعلقی گوشہ نشینی کی خشک واقعیت کو کس البیلے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

حکام ہیں خزانہ رتوب داخل ہے ساتھ — خدام ہیں شگوفہ ترک عمل کے ساتھ

لہ جے چڑیا گھر زندہ عجائب خانہ

باز ویں بار نہ زور گلے میں شوق وغود ۔۔۔ ہم تو مشاعرہ میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

یہی صدا ایک دوسری لے میں ہے

صاحب سے رکے تو راحتوں کو ترسے ۔۔۔ شوکت سے جھجکے تو لعنت برسے

بہتر ہے کہ بڑ رہو توکل بہ خدا ۔۔۔ باہر رکھو نہ قدم اپنے گھر سے

کہیں کہیں مطبعی ضبطی نے بھی مطلب ضبط اور لطف کو غارت کر دیا ہے

انڈیا نے تو کمر باندھی ہے ۔۔۔ کوئی "شوکتا" ہے کوئی "گاندھی" ہے

لیکن اب بھی بہت ہے اڑیل ۔۔۔ صرف پشتنگ اور کاندھی ہے

جو چوتھے مصرعہ میں ہے آخر میں صحیح لفظ "کاندہی" ہے جو پشتنگ ہی کی طرح شریر گھوڑے کی ایک حرکت کا نام ہے۔ کتاب میں بجائے کاف عربی کے کاف فارسی میں چھپ گیا یعنی "گاندھی"

اکبر کا اصل مزاق طبیعت توحید، معرفت، ضابطوں میں سرایت کیے ہوئے ہے مثلاً۔

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا ۔۔۔ دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

یا پھر ہے

نشان شوکت گاندھی جی بود ۔۔۔ کہ اکبر صرف کشف اجرا بود

اور یہ بھی ہے

حضرت برہم[1] نے فرمایا پسند اس رائے کو ۔۔۔ اونٹ کو زیبا جہانت اور کلیسں گائے کو

ان کو بڑھنا چاہیے ہم کو بچنا چاہیے ۔۔۔ ہوم اوان انکو مبارک ہو ہم کو تقوی چاہیے

اس طرح کے اشعار گاندھی نامہ میں بیسوں ہیں اور یہی کتاب کی اصل جان یا روح ہیں

---

[1] حضرت برہم فتحپوری اپنے زمانہ کے ایک طبیب (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

(۱۹)
(۱۸)

کلیات جدید اکبر الہ آبادی[۱]

گردوں کے ستم دیکھے اجڑا ہوا گھر دیکھا
دیکھا نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا

ترنم کی توقع نہ رکھئے حضرت اکبر خود بھی اپنے کلام کو تحت اللفظ سادہ لہجوں میں پڑھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی جیسے کہ وہ ۱۹۲۰ء سے قبل تھے ان سے تو یقیناً آپ خوب واقف ہوں گے۔ لکھنؤ میں کون ان سے ناواقف ہے۔؟ اب ذرا ان کی اکبر سے سرسری ملاقات کر لیجئے جو نوجوان جوان، ادھیڑ اور بوڑھے ہو چکنے کے بعد اب ۱۹۲۰ء میں ۷۵ سال کے بھی ہو چکے ہیں۔ اور دنیا سے رحلت فرمانے کا زمانہ ڈیڑھ ہی دو سال باقی رہ گیا ہے۔ کلام میں جتنی پختگی آنی تھی ممکن تھی سب آچکی ہے جس غزل کا مطلع ابھی عرض ہوا ہے یہ اسی زمانہ کی ہے۔ یہ

(حاشیہ کا بقیہ صفحہ گذشتہ) ادیب شاعر تھے۔ زیادہ شہرت ایڈیٹر اخبار مشرق (گورکھپور) پائی۔ [۲] اونٹ سے اشارہ حضرت اکبر کی زبان میں مسلمانوں اور گائے سے مراد ہندوؤں کی جانب ہوتا ہے۔

[۱] نشریہ لکھنؤ ریڈیو سے ۲۷ جنوری ۱۹۴۹ء کی شام کو وقت ۱۵ منٹ

دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

اب آنکھ اٹھانا ہے ایمان کی بربادی
اس بت کی نظر دیکھیں اور اس کا اثر دیکھا

دوسرے کے بعد تیسرا اور چوتھا شعر ؎

تکبیر ہی اچھی تھی تقریر ہی تھے جھگڑے — ترک ہم نے کیا اس کو جس شور میں شر دیکھا
دنیا کی یہ زینت ہے عقبیٰ کے وہ ہیں وعدے — غافل نے ادھر دیکھا عاقل نے ادھر دیکھا

پوری غزل میں بارہ شعر ہیں مطلع اور یہ دونوں سننے کے قابل ہیں ؎

اس عہد میں اے اکبر ہم اس دل سمجھے — تھوڑا سا جس دل میں اللہ کا ڈر دیکھا
صد شکر کہ میری نظر میں جچی نہیں اے اکبر — دنیا بہت چمکی بہتوں نے بھی سنور دیکھا

آخر عمر ہو پہنچے ہو پہنچے اور دنیا کے گرم سرد میں تجربے ہوتے ہوتے مذہبیت یوں بھی آجاتی ہے۔ اور پھر حضرت اکبر تو ماشاءاللہ شروع ہی سے اپنی شوخیوں اور شوخ کلامی کے ساتھ بڑا گہرا مذہبی ذہن اور بڑی گہری عرفانی نظر رکھتے تھے۔ منزل پیری پر پہنچے تو واقعی ایک شیخ وقت یا مرشد طریق بن چکے تھے۔ تو معبد معرفت، دعوت کا رنگ کلام میں جھلکتا ہوا ہمیشہ سے تھا۔ اب غزل کے جام سے بھی یہی مضمون چھلکنے لگا اور قطعہ ہو یا رباعی، مثنوی ہو یا غزل کا نمونہ آپ ابھی سن چکے۔ اسی ردیف کی ایک دوسری مختصر غزل کے بھی دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہے فضول نمائش جاہ و حشم — ہے عبث ہر ذخیرۂ سیم و طلا
جو ترے نہ ہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے جنہیں تو نہ ملا انہیں کچھ نہ ملا

ترے ذکر کا جو ملتا رہے صلہ نہیں غم کے ضعف کا مجھ کو گلا
مجھے عذر نہیں مجھے اب بھی چلا مگر اپنا ہی ساغر شوق پلا

اور ایک شعر حصہ غزلیات ہی کا ہے ؎

واعظ بنا وہ اس کا پیرو ہوا یہ اس کا
اسلئے خدا کو جانا اس نے خدا کو مانا

مفہوم بالکل ظاہر ہے۔ احکام الٰہی کا جو محض زبانی وعظ کہتا رہتا ہے۔ اسے خدا کا جاننے والا تو بے شک کہہ سکتے ہیں۔ لیکن خدا کو ماننے والا تو وہی کہلائے گا جو ان احکام پر عمل کرتا ہو۔ کلام ان کے نمونوں سے بدگمانی نہ گذرے کہ آخر عمر میں حضرت اکبر صرف اخلاقی حافظانہ رنگ کے شاعر رہ گئے تھے۔ اور ظرافت کا سرچشمہ خشک ہو چلا تھا تردید کے لئے کلیات چہارم کا مفصل مطالعہ کافی ہوگا۔ ۱۹۲۰ء میں برسات رکی ہوئی تھی۔ اساڑھ اور جیٹھ کی طرح تپتا رہا اور سارا دن نکل گیا اس پس منظر کو پیش نظر رکھ کر ظرافت کے چھینٹوں اور شوخی کی پھواروں کا ذرا لطف اٹھائیے ؎

ساون بھی بادلوں کو اس سال ہے ترستا
گرمی نہیں کھسکتی پانی نہیں برستا

حلوائیوں کو بھی ہے گرمی سے تلخ کامی
پوری سڑ اٹھی ہے خود ہو رہے ہیں خستا

کرنا پڑے گی باہم یاروں کو چشم پوشی
بازار میں جوانی کو کپڑا ملا نہ سستا

یہ حلوائیوں کی میٹھی میٹھی باتوں کے مقابلے میں "تلخ کامی" کیا خوب اور "پوری" اور "خستہ" کی خوشبوئیں تو یقین ہے کہ اپنو گی لہر یا طے کرتی ہوں آپ سب تک پہونچ رہی ہوں گی۔ پھر تیسرے شعر کا یہ بلیغ مضمون یہ سماں پیش کرتا ہے کہ خشک سالی کے گراں ہو گئی ہے۔ اور یہ گرانی کا اثر کپڑے پر بھی پڑا ہے۔ غریبوں کو تن پوشی بھی پوری طرح میسر نہ رہی نتیجہ یہ ہوا

کر حیاداروں کو خود ہی نظریں نیچی کرلینی پڑیں۔ حضرت اکبر کا زمانۂ وفات ستمبر ۱۹۲۱ء کا ہے۔ ۱۹۱۹ء کے وسط تک ان کے کلام کا جو مجموعہ تھا اور اس میں جتنے حصہ کو قابل اشاعت سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی میں ان کے کلیات کے تین حصوں میں شائع ہو چکا تھا۔ کچھ حصہ چھپنے سے انھوں نے اس وقت بھی چھوڑ دیا تھا۔ بے حد ذہین اور نہایت پرگو تھے۔ چھوٹی بڑی ہر چیز پر کچھ نہ کچھ فرماتے ضرور۔ کبھی کسی شعر کو وقت کی مصلحتوں سے چھپا ڈالتے اور کبھی کسی شعر کی اشاعت سے دوسروں کی ناگواری یا دل کی آزاری کا اندیشہ گمان گذرتا۔ اسے بھی دبا دیتے۔ اور پھر جس شعر سے ان کی خودداری میں پر زد پڑتی یعنی شوخی، ہنم ہربانی تک پہونچ جاتی اس کی اشاعت بھی گوارا نہ رکھتے۔ وسط ۱۹ء سے لیکر ستمبر ۲۱ء تک جو کچھ فرمایا وہ سارا مسودہ منتشر اور بے ترتیب، کاپیوں پر ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا۔ اب تک پڑا رہا۔ اور ۴۷ء میں جب ان کے صاحبزادے کا بھی انتقال ہوگیا جب کہیں ان کے پوتوں نے ان کی اشاعت کی اجازت دی۔ کتابستان (الہ آباد و کراچی) نے اس مجموعہ کلیات اکبر حصہ چہارم کے نام سے حال میں شائع کیا ہے۔ افسوس ہے کہ نہ کتاب کی ترتیب و تہذیب میں ابھی کسی خاص خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ اور نہ صحت کتابت میں کسی معمولی سی توجہ کا و محنت کا۔ نتیجہ یہ ہے کہ غلطیات بڑی کثرت سے رہ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مصرعے کے مصرعے بے موزوں ہو گئے رہیں پھر اکبر کی شاعری تو بڑی حد تک واقعاتی شاعری تھی۔ اپنے دور کے بکثرت واقعات کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے۔ ان تلمیحات سے لطف اٹھانے بلکہ محض سمجھنے کے لئے کثرت سی نوٹ اور حاشیے لازمی تھے۔ اس کا خیال بجز آخر

کے اچھے مضمون کے لئے کہیں بھی نہیں رکھا گیا ہے۔ ان بڑی اور اہم فروگذاشتوں نے افسوس اور سخت افسوس ہے کہ کتاب کا لطف بہت کچھ کھو دیا ہے اور اندیشہ قوی ہے کہ کہیں اس کا اثر خود شاعر کی شہرت و عظمت پر نہ پڑے۔ لیکن جو صاحب فہم و ادراک ہیں۔ وہ خود ہی سمجھ لیں گے کہ لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اگر بدسلیقگی کے ساتھ کثیف اور گندی پلیٹوں میں نکال کر میلے کچیلے دستر خوان پر چن دیا گیا ہے تو اس میں پکانے والے غریب کا کیا قصور؟

بہر حال آپ کی خدمت میں جو کلام پیش کیا جا رہا ہے وہ اسی کلیات سے ہے۔ ضخامت کچھ زیادہ نہیں ہے ۲۲×۲۶ کی تقطیع پر ۱۰۸ صفحہ کی ہے آپ نے اب تک ردیف الف کی سیر کی ہے اجازت دیجئے کہ ورق الٹنے سے قبل دو تین شعر اور اسی ردیف کے عرض کر دئے جائیں ایک غزل ہے "لباماں نہیں دیکھا" "پریشاں نہیں دیکھا" کی زمین میں۔ اس زمین میں یہ دو شعر جو اکبر حکیم عارف نے نکالے ہیں۔ اور یہ انھیں کا حصہ تھا ۔

غفلت میں تو پیری بھی نظر آتی ہے خودبینی
عبرت میں جوانی کو بھی نازاں نہیں دیکھا

جب مادہ غائب ہو گداز آئے کہاں سے
شمعوں کی طرح لمپ کو گریاں نہیں دیکھا

موم بتی اور لمپ کے فرق سے یہ ندرت مضمون کیا خوب پیدا کی ہے۔ اسی کے مثل ایک سیاسی رنگ کی غزل میں "اقبال" "انگا" "چنگال انگا" میں قوافی ملتے ہیں۔ اور خوب خیال کیجیے کہ ۴۶ء و ۴۷ء میں نہیں بلکہ لارڈ ریڈنگ کی گورا شاہی دبدبہ و جبروت کے عین شباب میں ۳۱ء میں اکبر کی نگاہ کشفی نے ان کی زبان سے یہ کہلا دیا تھا ؎

اس تمنا کے بر آنے میں بہت دیر ہے
یعنی ہم صیغۂ ماضی میں سنیں حال ان کا

حال کے معنے حصہ وسرگزشت کے ہیں۔ لیکن ماضی کے تلازمہ نے اس میں جان کیسی ڈال دی ہے۔

ردیف الف ختم ہوئی۔ ایک سرسری اچٹتی ہی ورق گردانی آگے بھی سہی لیکن کہیں کہیں تو کوئی شعر بہرحال حلقہ زنجیر بن کر رہے گا۔

ردیف "کر" نے ان دونوں شعروں نے ۲۰ و ۲۱ء دور تحریک خلافت و ترک موالات و نان کوآپریشن کی یاد میں تازہ کر دیں۔ الہ آباد کے مولانا شاہ محمد فاخر اور فرنگی محل کے مشہور عالم و پیشوا مولانا عبدالباری کی صورتیں نظر کے سامنے کر دیں۔

سرکار نے ہے شاد کر گاندھی ہوئے جاد
اور قوم ہے مغموم کر بگڑے گئے فاخر

گاندھی جی لارڈ ریڈنگ کی طلبی پر ان سے ملنے گئے!

اور دوسرا شعر ہے

اے چرخ ہوا ئے شوخ چلے اے شاخ عمل گلباری کر
کچھ سعی کریں کچھ کام کریں ہر شیخ کو عبدالباری کر

حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اپنڈت موہن موہن مالویہ، ان سب کا ذکر کہیں نام کی صراحت کے ساتھ کہیں اشارے کنائے ہیں۔ اس مجموعہ کے اندر موجود ہے۔ اور گاندھی جی اور علی برادران کا تذکرہ تو قدرتاً بہت زائد ہے۔ کہیں مدح و توصیف کے ساتھ اور کہیں ہجو تعریض کے ساتھ لہجہ ہیں۔ سہا سہاتے بر انھیں جو کچھ کہنا تھا اسے اکثر تو اپنی حسب عادت دل لگی کی لپیٹ میں کہہ گئے ہیں مثلاً اسی شعر میں ؎

غرض اسکے ہنسی مجھ کو بجائے پر زہی کہلا کر   یہ فرمانے میں سیر ہوئے گی نان جویں کیوں کر

کہیں کہیں ان کی ظریفانہ شاعری کی جان ان کا لفظی داخل خارج ہوتا ہے۔ اگر سننے والے کی نظر اس طرف نہیں گئی تو شعر بے معنی معلوم ہو گا۔ چنانچہ اس رنگ کا یہ شعر ہے۔

داد کیسی روٹی کی لالچ سے ہے یہ واہ واہ
شعر تو دادی ہے لیکن واہ واہ نانی کی طرف

اس کے دوسرے مصرعہ سے لطف اٹھانے کے لئے لازمی ہے کہ یہ ذہن نشین رہے کہ "دادی" یہاں صفت ہے "داد" کی اور "نانی" صفت ہے "نان" کی، اور دونوں کا ذکر پہلے مصرع میں آچکا۔

بعض غزلیں صرف دو شعروں کی ہیں۔ لیکن ان دو میں ایک شعر کتنا چاہیئے۔ پورے دیوان کی معنویت رکھتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں آپ بھی سن کر تائید کریں گے شعر ملاحظہ ہو۔

ملی ہیں دل سے جو مجھ کو وہ نازک اطلاعیں ہیں | خدا ہے اور فطرت حرف اس سے "کی شعاعیں ہیں
جوانی کی بہار باغ کی عمر دو روزہ کی | مرے دیوان کی نظروں میں کیا کیا الوداعیں ہیں

عارفانہ رنگ میں پہلا شعر اور عاشقانہ رنگ میں دوسرا شعر تو دامن نظر کو کھینچے بغیر کسی طرح نہیں نہیں رہیں گے۔

اخبار میں مرا حال شائع نہ کرو
معروف دعا ہو وقت ضائع نہ کرو

سیاسیات وقت سے اکبر کی دلی بیزاری تو اس شعر میں آگئی اور دوسرے میں ان کے سارے فلسفۂ الہیات کا نچوڑ آگیا ہے

جتنا زمانہ حشر کے پہلے ہے سب ہے آج
کہتا ہوں میں کل میں صرف قیامت کے روز کو

ردیف "کا" قدرتاً ذرا لمبی ہے۔ دو چار منٹ اس کی نیز بیں۔ بہرحال لگ جائیں گے۔ وحدت الوجود کے مضمون کو فارسی اور اردو کے بہت سے صوفی شاعروں نے اپنے اپنے رنگ میں ادا کیا ہے۔ اب ذرا اکبر کا کمال دیکھئے کہ کس لطافت اور جامعیت کے ساتھ اس سارے دریا کو دو ایک لفظوں کے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

خرد پوچھتی ہے یہ کیا ہو رہا ہے
صدائے دلی ہے خدا ہو رہا ہے

"خدا ہو رہا ہے"، جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب خدا ہی کے ظہور کی شانیں ہیں۔ اس کو نادر اسلوب سے ادا کرنا حصہ ہے اکبر کا۔ اسی لے میں ایک اور گیت ؎

کیا بتاؤں سخن ہوش ربا کے معنی　　　خود بخود کے وہی معنی جو خدا کے معنی

اور اس سے بھی بڑھ کر ؎

یہ مصرعہ مرے ہوش کھو رہا ہے　　　وہی تھا وہی ہے وہی ہو رہا ہے

"صاحب" پر چوٹیں، ہلکی اور لطیف چوٹیں تو اکبر کی شاعری کی جان تھیں۔ سیاسی گفتگو ہیں آج کی صحبت میں مناسب نہیں لیکن اتنا سن لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ؎

شکر اس کا بھی واجب ہے ان کی خدمت بھی ضرور
جان دی اللہ نے اور نوکری صاحب نے دی

طریقت اور شریعت کا جھگڑا صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اکبر صاحب ایک اشارہ کر دیتے ہیں اور دونوں کے جگڑ خود بخود مل جاتے ہیں ؎

یہی الفاظ کہ کر ذہن خفتہ کو جگاتا ہے — شریعت سر جھکاتا ہے طریقت دل لگاتا ہے

یہی مضمون بدلے ہوئے لفظوں میں ؎

نہ صورت کا تقاضہ ہے نہ رسموں کا تکلف ہے

شریعت کی بہ دل تعمیل ہو، بس یہ تصوف ہے

اور اس سے بھی زیادہ ہلکے پھلکے لطیف نرم انداز میں ؎

شریعت طریقت کو کیا پوچھتے ہو — شریعت ہے تم پر طریقت ہے تم میں

اور اس بحث میں بالکل حرف آخر ؎

شریعت میں ہے صورت فتح مبدر — طریقت میں ہے معنی شق صدر

نبوت کے اندر ہیں دونوں رنگ — بحث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

قطعات و رباعیات کے حصہ میں خوب خوب گل کھلائے ہیں

وقت یہ ہے کہ تحریک خلافت و ترک موالات زوروں پر ہے ہندو مسلم میل ہو رہا ہے۔ اور ملک کے سیاسی ہولوں ہر طرف خوب ہی اڑے ہوئے ہیں۔ اکبر اس سارے تماشہ کو دیکھتے ہیں۔ مگر ویسے ہی جیسے کوئی صوفی گوشہ نشین اپنی خانقاہ میں بیٹھا ہوا دنیا کے اتار چڑھاو اور سلطنتوں کے انقلاب کو دیکھا کرتا ہے اور وہیں سے بیٹھے ہوئے کوئی نعرہ مستانہ جو رندانہ لگا دیتا ہے۔ کبھی تو چہرہ پر ظرافت کے نقاب ڈالے ہوئے مثلاً ؎

نئی روشنی کا ہوا تیل کم — حکومت نے اس سے کیا میل کم

ادھر مولوی کسی ممبری میں تھے — نہ آفس ہی تھے نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے — سہاری کمیٹی میں ہل جائیے

اسی میل کا آج کل ہے ظہور — خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

اور کہیں سیدھے سادے بول ہیں۔

چکر میں ہے آ ہسٹری بھی — چرخہ بھی ہے اور منسٹری بھی
مرکز سے بہت ہٹے ہوئے ہیں — میدان میں مگر ڈٹے ہوئے ہیں
جن پر ہے خدا کی مہربانی — دونوں کو سمجھتے ہیں وہ خالی

اور کہیں خوان تو ظرافت کا ہے۔ لیکن اس کے اندر لگی ہوئی نعمتیں معرفت ذکراوت کی ہے۔

ہے چھتری بھی چپ نہ لٹکا ہے نہ بانگ ہے — پوری بھی خشک لب ہے کہ گھی چوچھا
کپڑا گراں ہے ستر عورت کا آشکار — کچھ بس نہیں زبان پر فقط ڈھانک ڈھالئے
ٹھلوان کا کرم ہے سدیشی کے بیل پر — لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی ہانک ہے
اکبر یہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن — اس کی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

ان کا اصل مزاق طبیعت تو یہ ہے۔

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا — دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

اور اس بنا پر اپنے وقت کی تحریکات اور جوش و خروش کو رشک و حسرت کی نظر سے نہیں صرف عبرت کی نظر سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔

نہ دلوں میں اب ذوق حق نہ دعا کا یاد ہے وہ سبق
نہ وہ آہ ہے نہ وہ شوق ہے نہ وہ تیر ہے نہ کمان ہے
نہ کمیٹیوں کی ترنگ اسے نہ ہوائے حلوہ و حنگ ہے — کرے کیا اب اکبر مضمحل نہ وہ طفل ہے نہ جوان ہے

اب ان کی آخری گذارش انھیں کے لفظوں سن کر بہتر ہوگا کہ حکمت و دانش کی اس محفل کو اسی نقطہ پر برخاست ہو جانے دیجیے۔

اتنا ہی گذارش کرنا ہے ہر ایک کو ایک دن مرنا ہے
ایشور کی خوشی تو پن میں ہے شیطان ہے لگا پاپ سے خوش
عیسیٰ نے دل روشن کو لیا اور تم نے فقط انجن کو لیا

کہتے ہیں کہ وہ بھی تھے باپ سے خوش اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش
میں خلق کی حالت جانچوں گا تو قد کی بلندی دیکھ کر
ہے یہ تو نگاہ اپنی اپنی میں وزن سے خوش تو ناپ سے خوش

نیا کلام اکبر[1]

نئے کلام اکبر سے مراد ظاہر ہے کہ ان کا تازہ کہا ہوا کلام نہیں ہو سکتا جبکہ حضرت اکبر کی وفات ہی کو ۲۷ سال ہو چکے۔ بلکہ مراد ان کا تازہ چھپا ہوا کلام ہے۔ اس حکیم و ظریف عارف شاعر کے تین کلیات اس کی زندگی میں ۱۹۱۹ء تک شائع ہو چکے تھے۔ وفات ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی دو ڈھائی سال کا کلام اب تک قلمی بیاض کی صورت میں خود شاعر کے ہاتھ کا لکھا ہوا شاعر کے خاندان میں محفوظ ہے

---

[1] صدق لکھنؤ مورخہ ۴ر مارچ ۱۹۴۹ء ۱۸ر مارچ و یکم اپریل و ۲۲ر اپریل ۱۳ر مئی و ۱۰ر جون ۱۹۴۹ء

صاحبزادہ ایک ہی تھے۔ وہ خدا معلوم کن مصلحتوں سے بار بار یاد دہانیوں اور تقاضوں کے باوجود اسے عمر بھر دبائے رہے۔ اب جب تین سال ہوئے۔ ان کا بھی انتقال ہوگیا تو مسودہ کتابستان الٰہ آباد (کراچی) کے حوالہ کیا۔ اس ناشر نے کلیات اکبر حصہ چہارم ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۱۰۸ صفحہ کی ضخامت کا شائع کیا ہے۔ قیمت چھ روپیہ رکھی ہے۔ جو گرانیوں کے اس زمانہ میں بھی عجیب نہیں اکثر شائقین کو گراں معلوم ہو۔ اچھے ناشر کا کام مسودہ کو جوں توں سستم پستم چھاپ ڈالنا ہی نہیں۔ کتاب کو صحت کتابت وطباعت کے انتہائی اہتمام واحتیاط اور ضروری حاشیوں کے ساتھ مرتب ومہذب کرنا بھی ہے قیمت کی گرانی دلوں پر یقیناً گراں گذرتی ہے۔ اگر ناشر نے اپنے فرائض کو درجہ اوسط میں بھی پورا کردیا ہوتا اور اپنے کمال بے توجہی اور بے احتیاطی میں غلطیوں کی پوٹ شاعر غریب کے نامۂ اعمال میں نہ لکھا دہ ہوتی۔

اس المناک اور تکلیف دہ لیکن نہایت ضروری بینہ کے بعد اصل کتاب کا مطالعہ شروع فرمائیے۔ اکبر کا یہ کلام ان کے بالکل آخری دور کا ہے۔ زبان خوب منجھ چکی ہے۔ استاد تو پہلے ہی تھے اب استادی اپنی پختگی کو پہونچ چکی تھی۔ سن کوئی ۷۴۔ ۷۵ سال کا سخن گوئی اور سخن سنجی کی ساری منزلیں طے کئے ہوئے قوائے جسمانی میں ضعف واضمحلال جو کچھ بھی پیدا ہو چکا۔ قوائے ذہنی وروحانی اپنے نشوو ونما کے کمال کو پہونچے ہوئے۔ غزل کہنے بیٹھتے تو جوش وولولہ کے مظاہرے کی جگہ حکمت ومعرفت کے موتی بکھرتے اور جوانی گذار کر جو کچھ سیکھا تھا۔ اسے دوسروں کو سناتے، سکھاتے بتاتے اس دور کی غزل

کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

پھری کا بھی رات کو میں نشو و نما کو کیا کرتا | نہ تھی وہ نکہت گل پھر صبا کو کیا کرتا
ارادہ تھا کہ میں مستی سے کر لوں قطع نظر | نہ ہو سکا مگر ایسا خدا کو کیا کرتا

یہ آخری مصرعہ ممکن نہیں کہ آپ سنکر نہ پڑھیں "خدا کو کیا کرتا" کیا جواب بے مثال ٹکڑا لگا ہے۔ معنی کا ایک دفتر کا دفتر اس ذرا سے فقرہ میں بند کر دیا ہے۔ تشریح جتنی چاہے کرتے چلے جائیے۔ جو بھی ارادہ کیا جیسی بھی پختہ تدبیریں کیں۔ ارادہ الٰہی سب پر غالب خدائی تدبیر سب پر غالب خدا کو مانے بغیر کوئی عذر پیش ہی چل سکتا۔ اور آگے چلئے ؎

زندگی کرتی ہی رہتی ہے مصیبت پیدا | باخدا اس میں بھی کر لیتے ہیں لذت پیدا
خلق صورت میں بھی کرتا ہے معافی کی تلاش | اور وہ معنی سے بھی کر لیتے ہیں صورت پیدا

اب اکبر معنویت کی جس بلندی پر ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ ذیل کی غزل پڑھئے جو خاصی بڑی بارہ شعروں کی ہے۔ ایک ایک شعر پر وجد آجائے گا ؎

گردوں کے ستم دیکھے اجڑا ہوا گھر دیکھا | دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا
اب آنکھ اٹھا لی ہے ایمان کی بربادی | اس بت کی نظر دیکھی اور اس کا اثر دیکھا
تقدیر مخالف تدبیر ہوئی قاصر | ممکن تھا جو کچھ ہم سے ہم نے وہ کر دیکھا

شعر ارشاد ہوا ؎

تکبیر ہی اچھی ہے تقریر میں تھے جھگڑے | ترک ہم نے کیا اس کو جس شور میں شر دیکھا

اور کون شور ایسا ہے جس کے اندر شر شامل نہیں ؎

دنیا کی یہ زینت ہے عقبیٰ کے نگہ میں دھوکے | غافل نے ادھر دیکھا عاقل نے ادھر دیکھا

قرآن میں آیا ہے ان کا قلب — افسوس ہے کہ سینوں میں کم دل کا اثر دیکھا
دریا میں رہا ڈوبا بات موتی میں آب آئی — بینا ہوئی آنکھ اس کو جب اشک سے تر دیکھا

مقطع دو ہیں اور دونوں نقل ہونے کے قابل ہے

اس عہد میں اے اکبر ہم اس کو دل سمجھے — تھوڑا سا بھی جس دل میں اللہ کا ڈر دیکھا
صد شکر مری نظریں بہکی نہیں اے اکبر — دنیا بہت دیکھی بت نے سنور دیکھا

پانچ شعروں کی یہ غزل پوری کی پوری سننے کے لائق ہے۔

احباب گذشتہ نے یہ سامان نہیں دیکھا — اچھے گئے ملت کو پریشان نہیں دیکھا
ابتک ہے انھیں حالت سابق کا تصور — یاروں نے مرا خانہ صد ویران نہیں دیکھا
ایک بار نظر آیا خزاں کا جو تصرف — پھر ہم نے کبھی سوئے گلستان نہیں دیکھا

آخر کے دو شعر خاص اکبری رنگ کے ہیں۔ یہ تخیل کسی اور کے حصہ میں آئی ہی نہیں ہے

غفلت میں تو پیری بھی نظر آتی ہے خودبیں — عزت میں جوانی کو بھی نازاں نہیں دیکھا

جب وہ غالب ہو گداز آئے کہاں سے
شمعوں کی طرح لمپ کو گریاں نہیں دیکھا

شمع اور لمپ دونوں کو ہم آپ سب ہی بار بار دیکھ چکے ہیں۔ دونوں کے فرق سے یہ شاعرانہ مضمون پیدا کرنا اکبر ہی کا حصہ تھا۔

ردیف الف کا نمونہ تغزل ناتمام رہ جائے گا اگر ایک مختصر سی غزل کے یہ دونوں مطلع آپ تک نہ پہونچے۔ ایک ایک شعر ایک ایک دیوان کے برابر ہے۔

ہے فضول نمائش جاہ و حشم — ہے عبث یہ ذخیرہ سیم و طلا
جو ترے نہ ہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے — جنہیں تو نہ ملا انھیں کچھ نہ ملا

ترے ذکر کا ملتا رہے حوصلہ نہیں عمر کے ضعف کا مجھ کو گلا
مجھے عذر نہیں اب بھی جلا مگر اپنا ہی ساغر شوق پلا

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ تو اس قابل ہے کہ زبانوں پر چڑھ کر ضرب المثل بن جائے ان شاء اللہ بن کر رہے گا ع

جو ترے نہ ہوئے تو وہ کچھ نہ ہوئے جنہیں تو نہ ملا انھیں کچھ نہ ملا

ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جس زمانہ کا یہ کلام ہے وہ وسط ۱۹۱۹ء سے لیکر ستمبر ۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ اور عین یہی دور تحریک خلافت، تحریک ترک موالات کے عروج کا تھا تاریخ ہند میں ایک انقلابی سخت بحران دور، اکبر کی شاعری تو بڑی حد تک واقعاتی شاعری ہی رہتی تھی۔ واقعات عصری کے اشارے کنائے کیا معنی صراحتیں تک ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ ٹھیک انھیں کی زبان اور انھیں کے روزمرہ میں ایک غزل ہے "اقبال انکا" "چندگال انکا" کی زمین میں مطلع کا دوسرا مصرعہ ہے ؎

بس گاندھی کو چھپا لیتا ہے اقبال انکا

اس غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اس تمنا کے بر آنے میں بہت دیر نہیں — یعنی ہم صیغۂ ماضی میں سنیں حال انکا

حال ہی ظاہر ہے کہ یہاں سرگذشت کے معنی میں ہے "صیغۂ ماضی" نے اسی حال کو کیا روشن کر دیا! کہنا چاہئے قال میں حال کا رنگ بھر دیا ؎

داڑھی دانتوں کو مدت سے بچا رکھا تھا — آج چوٹیا پہ بھی ہے حاوی ہے مگر بال انکا

داڑھی اور چوٹیا کی تلمیحیں بالکل کھلی ہوئی ہیں۔

یہ رنگ جب غزل تک میں نمایاں ہے تو رباعیات و قطعات میں کیوں نہ ہوتا ؎

اس وقت شیخ جی کو گاندھی سے میل سوجھا — صاحب نے روک چاہی ان کو بھی کھیل سوجھا
دونوں نے آخر اپنی اپنی لگا کے دیکھی — اور ان کو جیل سوجھا

جسے یاد ہے کہ عین اس زمانہ میں مانٹیگو کی "ریفارم اسکیم" کا ظہور ہو چکا تھا۔ اس کے معاً بعد گاندھی جی کی ہمنوائی میں ہندیوں کو جیل جانے کا سودا سوار ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ لے گا کہ یہ شاعری نہیں، عین تاریخ نگاری ہے۔

شعر و غزل کہتے جاتے ہیں۔ اہل مشاعرہ کا دل گرماتے جاتے ہیں پھر بھی باطن کی بیداری سے غافل نہیں ہوتے۔ اللہ کا نام لیتے جاتے اور آخرت کی یاد دلاتے جاتے ؎

دنیا کی طمع میں وہ پھسلا اور میں نے خدا کا نام لیا۔
لغزش میں وہ خاک آلود ہوا اور ضبط نے مجھ کو تھام لیا۔

ظاہر کا ادب ملحوظ رہا باطن بھی مگر محفوظ رہا
واعظ سے ادھر اک بات سنی ساقی سے ادھر اک جام لیا

یہی نغمہ ایک دوسرے ساز میں ؎

جہان فانی کے حادثوں کا خیال کب تک کیا کرے گا
جو ہو رہا تھا وہ ہو رہا ہے جو ہو رہا ہے ہوا کرے گا
کہاں تک اخبار ہوں گے شائع نہ کر عبادت کا وقت ضائع
کمیٹیاں قبر میں نہ ہوں گی نہ تو ہمیشہ جیا کرے گا

درس معرفت ایک رباعی کے قالب میں ؎

نہ راجگی کا مجھے شوق ہے نہ شاہی کا ‏ اگرچہ میں بھی ہوں طالب مگر خدائی کا
یہ وعظ مغرب اور اس کا اثر یہ ملت پر ‏ بنا ہے شوق ترقی سبب تباہی کا

آخری مصرعہ مکرر پڑھیئے " بنا ہے شوق ترقی سبب تباہی کا " اور دیکھیئے ذرا سے مصرعہ کتنی گہری اور جامع بات بنا دی۔ کہیں کہیں محض لفظی بلکہ حرفی داخل خارج سے ایک طرفہ لطف پیدا کر رہا ہے۔ مثلاً ؎

اورنگ زیب کی نہیں یہ سی، بو، تو دیکھیئے ‏ انگریز کا ظہور ہوا نقش جم گیا

اورنگ زیب کی املا سے " ب " اور " و " نکال دیجیئے تو حروف کا جو مجموعہ رہ جائے گا۔ انگریز کا املا اس سے بنے گا۔ اور کہیں کہیں ندرت قافیہ کی بہار دکھائی ہے۔

ہمارے دوست ہیں سنہا ہمارے لارڈ ہیں سنہا[1] ‏ ہماری طبع ساتھ ان کے ہے ظاہرا و باطن ہا

شعر سننے سے قبل کوئی بھی خیال کر سکتا تھا کہ " سنہا " کا قافیہ " باطنہا " ہو گا۔ لیکن اکثر تو ایک ایک شعر خاتم حکمت و معرفت کا نگیں ہے۔

حسن بت دیر میں کھینچے لئے جاتا ہے انہیں ‏ کیا نتیجہ ہے برہمن سے کھنچے رہنے کا

فرنگی حکومت سے بیزاری لیکن عین فرنگیت میں خود رنگ جانا اس عام ذہنیت پر کتنی لطیف تعریض ہے! ؎

(۲) دل نے کہا کہ گاڈ یہ جو اس سے جو پوچھا گاڈ میں کیا ‏ انہیں تو ان کا حال ہے بیٹھے رہیں تو کھا لیں کیا

ہندی مسلم غریب کی بے بسی پر کتنی سچی تصویر ہے۔

(۳) واعظ نہ پہ اس کا سیر دہواوہ اس کا ‏ اس نے خدا کو جانا اس نے خدا کو مانا

---

[1] بنگال کے انریبل ایس پی سنہا جنہیں ۱۹۱۹ء میں لارڈ سنہا کا خطاب دیا گیا تھا۔

واعظ بے عمل پر فارسی اور اردو دونوں میں طنز بہت کچھ کیا جا چکا ہے لیکن اسلوب بیان کی اس ندرت کی مثال بڑی مشکل سے ملے گی۔

ضعف کا مضمون ہی شق مزاج شعر کثرت سے باندھتے گئے ہیں اور انتہائی لاغری وغیرہ کے نکتے طرح طرح کے اس سے پیدا کئے ہیں۔ لیکن خود ضعف وعلالت کو ضعیف ثابت کرنے کا مضمون اکبر ہی کے لئے اٹھ رہا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور میری بیماری بھی ... اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار ہوا تو مر نہ سکا

اور ہنسی ہنسی میں آخرت کی یاد دلا دینا اس رنگ میں اکبر کا حریف کوئی نہیں کیا خوب ارشاد فرما گئے ہیں ؎

پتلون کے بٹن سے دھوتی کا پیچ اچھا ... دونوں سے وہ جو سمجھے دنیا کو ہیچ اچھا

گویا خشک نثر میں حضرت اکبر ۱۹۲۰ء میں یہ فرما رہے ہیں کہ فرنگی حکومت پر سودیشی حکومت کو یقیناً ترجیح ہے۔ لیکن ان دنیاوی حکومتوں کو کیا رکھا ہے۔ اصل شے تو دین و آخرت کی حکومت ہے۔

حسب ذیل حمد کے دو بند خدا معلوم کیوں ردیف "ب" میں جگہ پا گئے ہیں۔ بس منظر ابھی ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء والا پیش نظر رہے۔ یعنی تحریک خلافت و ترک موالات پورے جوش پر ہے اور گاندھی جی کی یہ تعلیم زور شور سے جاری ہے کہ انگریزی عہدے انگریزی خطابات انگریزی عدالتیں، انگریزی اسکول اور کالج چھوڑ چھاڑ سہانے سٹریل، ہو جاؤ۔ بہت سے اس وعظ کو دل کے کانوں سے سن رہے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ان سنی کر رہے ہیں۔ مصرع مومن دہلوی کے ایک مشہور شعر پر اور مصرعے لگائے گئے ہیں ؎

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب عہد پیری میں بدل سکتے کہاں قالب
مشتہر کر دیں یہ ہمدم ہیں جناب جالب عمر ساری تو کٹی عشق بتاں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

تو چہ ہمدوش انگلش میں رہے ہم ساکن جاہ و زر ہی تمنا میں کٹے زیست کے دن
وعظ گاندھی سے بدل سکتے ہیں کیونکر باطن عمر ساری تو کٹی عشق بتاں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ہمدم اس وقت "صوبہ متحدہ" بلکہ پنجاب کو چھوڑ کر سارے ہندوستان کا مشہور ترین روزنامہ تھا۔ اور اس کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی کی بھی ایسی ہی شہرت تھی۔

حضرت اکبر کبھی کبھی فارسی میں بے تکلف کہہ لیا کرتے تھے۔ انکے فارسی کلام کے نمونے اس دیوان میں زیادہ ملیں گے ردیف "د" میں تین تین مختلف غزلیں فارسی کی موجود ہیں۔ پہلی غزل کے دو شعر اور تیسری غزل پوری کی پوری اکبر کے مستقل پیام کی بہترین شارح اور ترجمان ہے

(۱) شان و شوکت گاندھی بود کہ اکبر صرف کشف ماجرا بود
بجائے ملک لیکن مدعائش خدا بود و خدا بود و خدا بود

(۲) روح از کن مکان دارہ اند بے نشانے راہ نشانے دارہ اند
برہمن در دیر بیش حرم ہر جبین راہ آستانے دادہ اند

(۳) بر رنگ یک رفتے دارد بر عیش ہر نظر را آہ سمانے دادہ اند
حال ہمہ دار و زبانے بہر گوش این زبان راہ ہم بہانے دادہ اند

ردیف "ر" میں سیاسی تعریفیں اور اخروی تبلیغ تو خوب ہی ہے ؎

(۱) غرض اس سے نہیں مجھ کو بھی ہے یہ نہ پوچھ کیونکر
یہ فرمائیں میسر آئے گی نان جویں کیونکر

(۲) شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج ان کی دخلی کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ اجل کی زد پر

لیکن بعض شعر ایسے ہیں جو آج بالکل معمہ بن گئے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے سنہ کی تلمیحات جاننا ضروری ہیں۔

سرکار تو ہے شاد کہ گاندھی ہوئے حاضر   اور قوم ہے مغموم کہ پکڑے گئے خادم

اس کا قصہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ نے وائسرائے نے سر سپرو (وزیر قانون حکومت ہند) اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے مشورے سے ایک طرف تو مسلمانوں کو دبانا شروع کیا۔ چنانچہ ان کے دوسرے بڑے ہندو(ا) محمد شوکت علی کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلا دیا۔ اور دوسری طرف اس سے ذرا قبل گاندھی جی کو شرف باریابی سے نوازا گیا۔ الہ آباد کے مشہور خلافتی کارکن مولوی شاہ محمد فاخر و اکرہ شاہ اجمل رائے) بھی اس زمانے میں گرفتار ہوئے تھے۔

یا یہ شعر

اے چرخ ہوا لے شوق چلے اے شاخ عمل گل باری کر
کچھ سعی کریں کچھ کام کریں ہر شیخ کو عبدالباری کر

اس میں اشارہ ہے فرنگی محل لکھنؤ کے نامور عالم و شیخ طریقت مولانا قیام الدین عبدالباری کی طرف جو "علی برادران" کے پیر و مرشد ہونے کے علاوہ خود بھی سیاسی لیڈر کی حیثیت رکھتے اور اپنی پرجوش تقریروں کے لئے مشہور تھے۔

ردیف "ذ" میں کل ایک شعر ہے اور اس کے سمجھنے والے اب عنقا ہو گئے ہیں ؎

دلگیر ہے مہمان مرے کیوں ہو نہ اس پر مجھ کو ناز
اپنے لئے دل گیر ہیں میرے دل نواز

دلگیر کو کوئی اگر صفت یا اسم نکرہ سمجھ کر پڑھے گا تو مطلب کیا خاک سمجھے گا۔ "دلگیر" یہاں اسم معرفہ ہے آگرہ (اکبرآباد) کے شاہ نظام الدین کا تخلص تھا۔ صوفی مشرب ہونے کے ساتھ ہی ایک ادبی ماہنامہ "نقاد" کے نام سے نکالتے تھے۔ کئی سال تک اردو کے ادبی حلقوں میں ان کے پرچے کا چرچا رہا۔ کلیات اکبر کے مرتب توضیحی حاشیوں کی ضرورت ان اہم موقعوں پر نہ سمجھے اور اس طرح حضرت اکبر پر اچھا خاصا ظلم کر دیا

ردیف "ش" میں ایک قطعہ ہے۔ دونوں مصرعے غیر موزوں چھپے ہیں صحیح یوں پڑھئے ؎

گورمنٹوں میں بڑی عقل ہے ۔۔۔ مگر ان میں ایکا نہیں ہے نہ جوش
جو ہیں گاندھوی وہ ہیں اکثر اجڈ ۔۔۔ مگر اک امنگ ان میں ہے اور جوش

کتاب میں گورمنٹوں اور گاندھی چھپا ہے جس سے وزن قائم نہیں رہتا۔ ردیف "ف" میں ایک ایسا شعر ہے جو ایک لفظی پیچ کی بنا پر غالباً پیچیدہ ہو گیا ہے اور بغیر تشریح کے بہتوں کے سمجھ میں نہ آئے گا۔ فرماتے ہیں ؎

داد کیسی روٹی کی لالچ سے ہے پروا ہ واہ
شعر تو دادی ہے لیکن واہ واہ نانی ہے

دادی یہاں کے رشتہ معنی میں نہیں بلکہ فارسی لفظ "داد" کی

صفت ہے۔ اسی طرح "نانی" ذہن رشتہ کی طرف نہ جائے بلکہ یہ بھی فارسی لفظ "نان" کی صفت ہے اور جس کے لئے اردو لفظ روٹی ہے پہلے مصرعہ میں آچکا ہے۔

اس ردیف میں دیوان کی متعدد ردیفوں کی طرح غزل تو کوئی نہیں البتہ دو تین شعر ہند سے کہے ہیں۔

(۱) دوا بھی ہے تو توجہ نہ ہے خدا کی طرف ‏ خودی سے کیجئے اب ہجرت بس اب خدا کی طرف

(۲) کفر کالا سا لگا دنیا کی زینت کی طرف ‏ حرص سے اب کیجئے ہجرت قناعت کی طرف

(۳) رخ جو پھیر ترک موالات کا عقبیٰ کی طرف ‏ تری آنکھیں نہ اٹھیں زینت دنیا کی طرف

ایک بار پھر یاد کر لیجئے کہ ترک موالات کی طرح ۱۹۲۰ء[۵۱] میں تحریک ہجرت کا بھی بڑا زور ہندوستان میں رہ چکا ہے۔

ردیف "ک" میں کل ایک شعر ہے مگر سننے کے قابل ہے

دعائے سحر کو بنا اپنا پیک ‏ دل صدق سے کہہ اتینا الیک

آیات قرآنی کی تضمین کی یہ مثال پہلی یا آخری نہیں۔ ردیف "ت" میں بھی ایک شعر اسی رنگ کا آچکا ہے۔ اس کا ذکر وہاں رہ گیا تھا۔ شعر کتاب میں غلط چھپا ہوا ہے صحیح یوں تھا

نور امید میں سبح تو مانگ ہدایت رب سے تو
قرآں سے دل و تباہ لاتی سامن البیت

ردیف "دال" اور بھی کا ذرا تفصیل سے جائزہ آگے آئے

۵۱۔ ۱۹۲۰ء میں مانٹیگو ریفارم کے تحت وزارتیں ہر صوبہ میں نئی نئی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئی تھیں اور گاندھی جی کے کھدر اور چرخ کی تحریک بھی نئی نئی اور زوروں کے ساتھ چلی تھی

اس کے قبل ردیف "ن" بھی خاصی طویل اور بڑی شگفتہ ہے۔ غزلیں بھی اس میں خوب ہیں اور قطعے اور فردیں بھی خوب ہیں۔ کی ابتدا ایک قطعے سے کیجیے ؎

ہزاروں ہی طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہوئے ہیں
طواف ان کے گھروں کا ہے انھیں سڑکوں کے پھیرے ہیں

سواری ہے ان کی راہ ان کی اور ڈاک ان کی
انھیں کی فوج ہے ان کی پولیس ہے اور ناک ان کی

ہوائیں ابر شب ان کے سمندر میں جہاز ان کے
عمل ہم ہیں کیا کرتے نا معلوم راز ان کے

علوم ان کے زبان ان کے ہر بس ان کے لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات ان کے

قرائن کہہ رہے ہیں آرہا ہے دور فتنوں کا
ہوائیں وہ چلیں گی کہ یہ فتنہ مٹ جائے گا کتنوں کا

کسی کی چل سکے گی کیا اگر قرب قیامت ہے
مگر اس وقت ادھر چرخا ادھر ان کی وزارت ہے

متفرق اشعار ؎

(۱) واقف ہو کہ انھیں ہم کیا دوں — اخبار وہاں کے کیا خرید دوں

(۲) اللہ ہے تخصیت حوادث ہم سے زیادہ ابھر رہے ہیں
یہ وقت ہم پہ گذر رہا ہے کہ وقت پر ہم گذر رہے ہیں

(۳) کہوں ناز دین پر ہے کہوں پتنے ہوئے ہیں
توحید کلب ہے دعویٰ ہے اور بت بنے ہوئے ہیں

(۴) ذروں کا بھی ثبوت نہیں امتحان میں — سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں جہان میں

(۵) اب شیخ جی مقیم برہمن کے پاس ہیں   گائیں اچھل رہی ہیں قصائی اداس ہیں

(۶) ہر ممبری کی دھن میں مذہب سے منحرف ہیں۔
مسجد میں متحد تھے دو لوں میں مختلف ہیں

(۷) وہ بغداد میں ہیں ہم مندر میں گم ہوں   شتر کینہ وہ ہیں تو ہیں گاؤ دم ہوں

(۸) سینگ غائب ہیں تو پھر گردن اٹھانا ہے فضول
حضرت اشتر سے کہدو لدیں یا ذبح ہوں

(۹) بات تو کچھ تو ہو گئی لا چارج ہیں   آج کل دنیا ہے ان چارج میں

(۱۰) خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

امت اسلامی کی وحدت کے اظہار کے لحاظ سے یہ شعر اپنی آپ ہے۔ مولانا شوکت علی سرکار سے بغاوت اور سر ضیاء الدین (علی گڑھ والے) اپنی سرکاری وفاداری کے لحاظ سے ایک ایک سرے پر تھے ان کو سمو کر درس وحدت دیتے ہیں ؎

[۱] ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع دونوں میں ہیں   فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں ہیں اور یہ زو میں

دو دو شعروں کے بعض قطعے خوب ہیں مثلاً

(۱) تو نے پڑھا ہے دنیا کو صرف ہسٹری میں   دنیا کو دیکھ عاقل دنیا کی ہسٹری میں

(۲) ہے سلطنت کی خواہش تو رہے ہیں   صاحب بنا رہے ہیں ہم لوگ بن رہے ہیں

---

[۱] برطانیہ کا مشہور و معروف وزیر اعظم جس کے ہاتھ پر گویا جنگ عظیم فتح ہوئی تھی۔

[۲] چڑیا گھر۔ زندہ عجائب خانہ۔ فارسی کا وہ مشہور شعر یاد کیجیے

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در مکتب عشق   او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

دس ملی ہیں دل سے مجھ کو وہ نازک ادا ہیں جہاں۔ خدا ہے اور فطرت اسی " ہی" کی شعاعیں ہیں
جوانی کی بہار باغ کی عمر دو روزہ کی مرے دیوان کی نظموں میں کیا کیا الوداعیں ہیں

پہلے قطعہ دنیا کی کتاب کے ذریعہ" پڑھیے" اور چشم بصیرت سے دیکھتے جائیں، جو فرق پیدا کیا ہے وہ داد کے قابل ہے اور دوسرے قطعہ کے دونوں شعر وجد آفریں ہیں سیاسیات کے قالب ہیں مذہبیت کی روح

بعض رباعیات بھی اسی دور ترک موالات کی گویا عکسی تصویریں ہیں۔
مثلاً:۔

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم دلوں کو طاقت حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عشق ہمارا کیا بھلائے نلسخ ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

اکبر کی بعض خاص اصطلاحات تو سنی ہیں " صاحب" " خاں ماں" "مس" " برہمن" " گائے" " اونٹ" وغیرہ۔ اب یہاں "شیخ" اور "مجتہد" کے فرق کو بھی سمجھ لیجیے " شیخ" جب یہ مجتہد کے مقابلہ میں ہو اسے ان کی مراد علمائے اہل سنت سے ہوتی ہے اور "مجتہد" سے علمائے شیعہ مے ہے اس کے بعد ذیل کا شعر پڑھیے۔

شیخ جی تو گردشوں پر پہلے سے تیار ہیں مجتہد مرکز تھے لیکن وہ بھی اب پرکار ہیں

"مرکز" "مدور" "پرکار" اور "گردش" کی مناسبتوں کا کیا کہنا۔

غزلیں دس ردیف میں ایک آدھ نہیں کئی ایک پڑھیے اور وجد کرنے کے قابل ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

(۱) دیکھو ان دیکھا یا واپس لے دانا سے دل لگی ہے دل کی لگن۔
جو کچھ بھی ملا ہے شکر ہے اس کا جھن جلنے اگر جب بھی ہیں مگن
جے روز جینا ہے جیتے ہیں، ان کھاتے ہیں جل پیتے ہیں

سامان حفاظت کچھ بھی نہیں پاس نہ اپنے سورڈ[1] نہ گن

(۵) فلک جھکتا نہیں اور زمیں ہٹے گی نہیں ۔ بغیر رنج والم زندگی کٹے گی نہیں
سمجھ رہا ہوں یہ ہیں گے مصیبتیں لیکن ۔ تمہارے ساتھ محبت مری گھٹے گی نہیں

(۶) اس سرچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں ۔ گاندھی تو وجد میں ہیں یہ کہو اچھل رہے ہیں
نشو و نمائے کونسل جن کو نہیں میسر ۔ پبلک کی جے میں ان کے مضمون پل رہے ہیں
ہیں دفعہ اور اپیلیں یا اور دلیلیں ۔ اور کید مغربی کے ارمان نکل رہے ہیں
یہ سارے کارنامے اللہ کے ہیں اکبر ۔ کیا بات جانے دم زدن یوں ہی چل رہے ہیں

معرکے کی غزل دہن کی غزل ہے ۔۔۔ آٹھ میں سے پورے چھ شعر ملاحظہ ہوں :-

(۷) نئی منطق اب ہوں خضر رہ و طریق اپنا رہا کہاں
وہ اصول ہی جو شکست ہوں تو وفائے دل کی بنا کہاں
کوئی ڈارون کا مرید ہے کوئی تجربوں کا مستہد ہے
وہ خیال سر ازل کہاں وہ سرور یاد خدا کہاں
نہ حدیث عشق ہی رہی نہ وہ مثال حسن حسین رہی
دل دردمند و شوق لقا کہاں وہ حجاب لطف حیا کہاں
نہ محبتوں کا وہ ساز ہے نہ بزرگیوں سے نباہ ہے
وہ ادب کہاں وہ وفا کہاں وہ خلوص دل کی ادا کہاں
یہ فریب ورزگی ہے روش کہ خزاں پہ ہوتی ہے دارِنش
وہ بہار لالہ و گل کہاں وہ چمن کہاں وہ صبا کہاں
ہوئی ختم ہے ہراں یہ داستان اور اٹھا ہے اب یہ فغاں
نہیں اکبر اپنے حواس میں کوئی اس سے پوچھے رہا کہاں

---

[1] SWORD تلوار ۔ GUN بندوق

ردیف "و" مزیدار ہے۔ اور ایسی ہی ردیف "ہ" جو بہت مختصر ہے سب اسی تعریفیں خوب ہیں۔ اور جا بجا عرفانی نکتوں اور روحانی حقیقتوں سے ملی جلی کہیں سادہ انداز میں اور کہیں سادہ انداز میں اور کہیں ظرافت کے پردہ میں ملاحظہ ہو ؎

(۱) اخبار میں میرا حال شائع نہ کرو — مصروف دعا ہو وقت ضائع نہ کرو

(۲) دنیا تو اسی گو کی کنیز آج ہے اکبر — صاحب سے ہو بیزار تو دنیا کو بھی چھوڑ دو

(۳) نہ صاحب کو مارو نہ صاحب سے کھاؤ — بجاتے رہو ٹل بنو اور مانگو

(۴) متحد یورپ کی قوت ہو تو ہو تو ہو — ہم بھی اب ہیں کلو گنلو ریڈ کو

(۵) ہر بات کچھ نہیں ہے سب کچھ — سمجھے بھی ہوتی بس نہ کہو اب کچھ

(۶) جتنا زمانہ حشر کے پہلے ہے سب ہے آج — کہتا ہوں گل میں حرف قیامت کے روز کو

رباعیاں اور قطعے بھی اس مرتبہ اور اسی معیار کے ہیں ؎

(۱) یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف — وہ فکر میں ہیں مسلمانی ہی ندارد ہو
زیادہ "ان" سے رہو محترز کہ ہندو سے — یہ خود ہی سوچ لو دل میں اگر نہ کچھ کرو

(۲) حکام ہے خزانہ و توپ و رفل کے ساتھ — خدام ہیں شگوفہ ترک گل کے ساتھ
بازو میں بال نہ زور نہ گلے کو شوق شور — ہم تو مشاعرہ میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

(۳) ہو دل میں انور کی جو ہوس ہنگامہ کروں تو پوں سے بھنو
گاندھی کی جو حکمت خوش آئے چپ چاپ گزی کے تھان بنو
صاحب کی رفاقت ہو جو پسند آسام میں جا کر چائے چنو
اکبر کی جو مانو محو دعا ہو اور حمد خدا کے گیت سنو

(آسام میں چائے کی بہت بڑی بڑی کاشتیں اس وقت انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی عجب نہیں جو کسی حد تک اب بھی ہوں اور انور سے مراد ترکی کے مشہور غازی

وجاہد النور باشا ہیں ۔

(۴) باطن کا جمال آئے بھی نظر راز درون ظاہر بھی نہ ہو
آسان نہیں رہے اگر عاشق بھی بنے کافر بھی نہ ہو
ہے اب تو بھی کو دعویٰ عقل، اللہ کا جن کو خوف نہیں
کم ملتا ہے ایسا بندہ کوئی کو دل بھی نہ ہو کافر بھی نہ ہو

(۵) ہو چکی باب کی سیر یا اللہ — عاقبت ہو بخیر یا اللہ
رکھ حرم میں مرا قدم ثابت — ہے کشش سوئے دیر یا اللہ
ہم سے لاٹھی بھی اٹھ نہیں سکتی — اور ادھر ہے خیر یا اللہ
اپنوں میں دے محبت و قوت — ہم پہ ہنستے ہیں غیر یا اللہ

دیوان بھر میں سب سے زیادہ مفصل اور سب سے بڑھ کر قابل دید ردیف ی ہے ضخامت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مرتب صاحب نے اور بہت سے کلام کو جن کا کوئی تعلق ردیف ی سے نہیں سب اسی کے تحت ڈال دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باقی کل دیوان ۲۵ صفحوں میں آگیا اور ۲۵ سے صفحہ ۱۰۵ تک اسی ایک ردیف کی نذر ہیں۔

پہلے اس ردیف کی غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو انشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک نکلیں گی ۔

(۱) جان مشتاق ہے تری میرا جینا ہی — مست ہوں جام ازل سے مرا پینا ہے یہی
ترے محبوب کی منزل کی زیارت ہو نصیب — دیکھ لے چشم تمنا کہ مدینہ ہے یہی
منزل عشق میں رکھ قدم (بے خودی زینہ ہے) — حسن کہتا ہے مرے بام کا زینہ ہے یہی
نور و ظلمت میں نظر آئے فقط شان ظہور — رات دن آرزو دیدہ جینا ہے یہی
بیش توحید بتوں کا سر مغرور ہے خم — آپ کو کہنا ہے جو مجھ سے تو وہ کہنا ہے یہی

(۱) زمیں تو کھد کھدا کر ہو گئی ہے یک بیک شامل ‌ ‌ مگر ہاں آسمان کی کچھ پرانی شان ہے باقی ہے

سوا جو کچھ تھا باقی ہو گیا سرکار میں داخل ‌ ‌ خدا کا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے

(۲) مجھے کیا خبر یہ ہے کیا اثر نہ وہ ہوش ہے کہ وہ جان ہے

فقط ایک نظر ہے جہاں پر نہ خیال ہے نہ زبان ہے

نہ دماغ صرف رہ نظر نہ دلیل باعث درد سر

وہی جوش لذت دید ہے نہ خیال ہے نہ خیال ہے نہ گمان ہے

نہ یہاں حدوں کے نشاں نہ محل حرف یہاں کہیں

مرا عشق ہے ترا حسن ہے مری آنکھ ہے تری شان ہے

معرفت و روحانیت کا رنگ تو عام ہے باقی ایک آدھ غزل تو غزل ہی نہیں سو فی صدی مناجات ہے مثلاً ؎

(۳) میں مصیبتوں میں ہوں اے خدا مرا دل غموں سے دونیم ہے

مرے حال زار پہ رحم کر تو رحیم ہے تو کریم ہے

میں بہت ہوں بیکس و ناتواں مری بیکسی کی خبر ہے

ترے رحم ہی کی امید ہے تو قدیر ہے تو علیم ہے

ترے فضل ہی کا یہ کام ہے مجھے بخش دے مجھے خلد دے

مری معصیت تو یہ ہے کہ یہ کہ مستحق جحیم ہے

غزلوں سے کہیں زیادہ یہ حصہ رباعیات، قطعات اور واقعاتی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ زیادہ تر ظرافت کی چاشنی کے ساتھ اور کہیں کہیں سادہ و سلیس زبان میں لیکن عصری تلمیحات عموماً اس کثرت سے ہیں کہ مرتب صاحب نے ان حصوں کو توضیحی و تعارفی حاشیوں سے محروم رکھ کر شدید ظلم شاعری کی روح پر کیا ہے مثلاً

ایک نظم بھی ہے ؎

طب دہلی کی مدد سے بت کی صحت بڑھ گئی — قدرت باری سے بتخانہ کی شوکت بڑھ گئی

ڈنڈوت جب شیخ صاحب نے بھی پیش صنم کی — گاندھی گاندھی ہو گئے چیلوں کی ہمت بڑھ گئی

آکسن بھائی نے قربانی تعصب کی جو کی — جان بل جب ہو گئے گایوں کی رفعت بڑھ گئی

وہ یہ کہتے تھے کہ صاحب ہی کا ہے سارا ستم — آپ فرماتے ہیں بابو کی شرارت بڑھ گئی

اب جب تک اس کے متعلق یہ سب صراحتیں پیش نظر نہ ہوں کہ طب دہلی سے اشارہ حاذق الملک[1] حکیم اجمل خاں کی طرف ہے۔ جو اس وقت گاندھی جی کے خاص رفیق ہو چکے تھے۔

بادہ کی تلمیح وقت کے نامور سیاسی لیڈر اور عالم شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی جانب اور شوکت کا مولانا شوکت علی کی جانب اور دوسرا شعر اس وقت کے مسلمانوں کی تصویر ہے۔ اور تیسرے شعر میں آکسن بھائی سے مراد مولانا محمد علی ہیں۔ جو آکسفرڈ کے گریجویٹ ہونے کی بنا پر آکسن کہے جاتے تھے۔ (لفظ آکسن کا املا انگریزی میں دو طرح لکھا جاتا ہے۔ ایک معنی آکسفرڈ والے کے ہیں اور دوسرا آکسن کی جمع بیل معنی میں ہے) جنہوں نے اس وقت فرمایا تھا کہ ہندو جس طرح ہم سے خلافت کے معاملے میں ستیہ و شکر ہو رہے ہیں اس کا لحاظ کرتے ہیں گائے کی قربانی ترک کرتا ہوں۔ نیز یہ کہ "جان بل" سے مراد انگریز قوم ہے۔ اور بل کے لفظی معنی بیل کے ہیں تو بغیر ان ساری صراحتوں کے کوئی کیا لطف اس قطعہ سے اٹھا سکتا ہے ؎

متعدد نظموں میں عصری حالات بالکل آئینہ ہیں اور صاحب کی طرف مخاطبت صاف ہے۔ مثلاً ؎

دل یہ وہ ہنگامہ جس کی ہر طرف تائید ہے — آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے

---

[1] یہ خطاب حکیم صاحب کو سرکار انگریزی کا دیا ہوا تھا۔ اور اپنے وقت میں بہت اونچا اور معزز (بقیہ صفحہ دوسرے پر)

مستحقان ادب کو آپ نے رسوا کیا | آپ کے دعوے عظمت کی اب تردید ہے

(۱۲) سائنس تم نے جانا اور اس کو بھی بڑھایا | دولت لڑائی تم نے اور اس نے گپ اڑائی

تم نے مال مارا اور کھولدی تجارت | یہ ترجموں میں الجھا بس داستاں سنائی

تم متحد ہوئے اور دکھلائی اپنی قوت | اس نے سلف کو روندا اس ہی کی لڑائی

تم نے نگاہ رکھا کل اپنے ضابطوں کو | اس بے ادب نے سیکھی بے دینی و ڈھٹائی

یہ برکتیں تمہاری تعلیم کی بلا ہیں | مارا ترجموں نے اللہ کی دہائی

(۱۳) ہے جھرجھری بھی جب پانی پلا ہے نہ بانک ہے | دل بھی خشک لب ہے رگ بھی جو چھانک ہے

کبر اگر ان سے ہے ستر عورت کا آشکار | کچھ بس نہیں زباں پر فقط ڈھانڈ ڈھانک ہے

بھگوان کا کرم ہے سودیشی کے بل پر | لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی ہانک ہے

اکبر پہ بار ہے یہ تماشائے دل شکن | اس کی تو آخرت کی طرف تاک جھانک ہے

(۱۴) چکر میں ہے آج ہمسٹری بھی | جغرافیہ بھی ہے اور منسٹری بھی

مرکز سے ہٹ ہٹے ہوئے ہیں | میدان میں مگر ڈٹے ہوئے ہیں

جن پر ہے خدا کی مہربانی | دونوں کو سمجھتے ہیں فانی

گاندھی اور مالوی میں ہے کیا فرق | اب اس بحث میں ہیں ناحق غرق

فرق وہ ہے جو نہ عشق میں ہے | ایک کاشی میں ایک دمشق میں ہے

۱۹ء کے آخر میں زور و شور تحریک ہندوستان کے لئے ایک امیر شریعت کے انتخاب میں اٹھی تھی اور بعض حلقوں میں اس کے لئے نام مولانا ابو الکلام آزاد کا پیش ہوا تھا مولانا عبد الباری اور دوسرے حضرات فرنگی محل اس سے اختلاف رکھتے تھے۔

ترکوں نے نئی نئی حکومت انگورہ (انقرہ) قائم کی تھی کمال پاشا اس وقت غازی مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ والی مکہ شریف حسین کے فرزند امیر فیصل

بقیہ حاشیہ گذشتہ) سمجھا جاتا تھا حکیم صاحب ایک زمانہ تک گورنمنٹ اور حکام میں بڑے بارسوخ سمجھے جاتے تھے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کا عروج ہو رہا تھا۔ بعض باریک بینوں کا خیال تھا کہ امیر شریعت کا جھگڑا برطانیہ کا اٹھایا ہوا ہے۔ بہرحال سارا پس منظر رکھ کر اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو ؎

امیر شریعت کی تحریک ہے — کہا اکثروں نے ٹھیک ہے

فرنگی محل کو ہے اس میں سکوت — ضرورت کا ملتے نہیں وہ ثبوت

ادھر ایک کو ہے عراقی مذاق — ادھر ترک انگورہ ہے دل پر شاق

وہ کہتے ہیں فیصل کا اٹھا ہے ہاتھ — امیر شریعت بھی آجائیں ساتھ

یہ کہتے ہیں کوشش میں ہیں جو کمال — نئی بات کا کیوں کرو تم خیال

گورنمنٹ خوش ہے اس بات سے — کہ یہ کام ہو ہند کے ہاتھ سے

نئے مولوی پر سر جوش ہیں — جو پیر طریقت ہیں خاموش ہیں

توقع کریں اس عقلوں سے کیا — حکومت چھنی جب تو نقلوں سے کیا

کوئی کہتا ہے کیا کمال و جمال — خلا فلسفہ میں ہے بالکل محال

خلیفہ نہیں تو پیرو سہی — نہ ہو تحت فی الارض سیر[3] ہی سہی

وہ کہتے ہیں کافی ہیں اہل طریق — نہ ڈھونڈو یہاں تم سیاسی رفیق

بعض قطعے تمام تر عارفانہ رنگ کے ہیں ؎

۱؎ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار ہندوستان مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے ماتحت قائم ہوئی تھیں۔ گاندھی کی تحریک کھدر، چرخہ بھی خوب زوروں پر چل رہی تھی

۲؎ مشہور نیشنلسٹ لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ الہ آبادی جو اپنی مصلحت بینی اور فرزانگی کے لئے مشہور تھے۔

۳؎ اشارہ ہے آیۂ قرآنی سیروا فی الارض کی طرف

بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۳۳) تحریک ترک موالات میں بڑھ کر حکیم صاحب نے خطاب کو واپس کر دیا تھا اور کہنے لگے جو قوم نے خطاب مسیح الملک کا کر دیا ہے

(۱) ذہن مشتاق رہا محو کا نہ کا — رنگ بدلا کیا زمانہ کا
شوخیٔ عقل رہ گئی شک میں — کٹ گئی عمر مفت بک بک میں
کر دیا دل کو ابن و آلد نے تباہ — مدد اے لا الٰہ الا اللہ

(۲) ارمان بقدر طاقت نکل رہے ہیں — صاحب تو اڑ رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں
غصے میں ہیں ہم ان پر وہ ہم پر ہنس رہے ہیں — دام فریب دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہیئے کہ طاعت سے منہ نہ موڑیں — وہ اپنا جبر چھوڑیں ہم صبر کو نہ چھوڑیں

(۳) الیوم اکملت لکم دینکم[۱] اسلام کو بس ہے — باقی اگر کچھ ہے تو وہ دنیا کی ہوس ہے
توحید کا مسلم نے بچا رکھا ہے ڈنکا طاعت میں — وہ رکتا نہیں بندہ ہو کہ لنکا سے
اتممت علیکم[۲] کا تو کچھ نہ کر سکے یورپ — املی لہم[۳] ارشاد تھا ایجاد ہوں توپ

(۴) ہر چند حال دنیا اس وقت منقلب ہے — ایمان مطمئن ہے اور کفر مضطرب ہے

کہیں کہیں معرفت کے ساتھ ظرافت شیر و شکر ہو کر جلوہ گر ہے مثلاً

(۵) اپنی جگہ ہر اک کا ارمان نکل رہا ہے — توپیں بھی چل رہی ہیں جوتا بھی چل رہا ہے
لیکن رہا چیکا دل میں یہ بات سوجھی — کس تقویت پہ اٹھوں بجز نہ سوجھی
حضرت برہم نے فرمایا بند اس رٹنے کو — اونٹ کو زیبا نہیں نیت تھا اور کلیاں گلنے کو
ان کو بڑھنا چاہیئے اور ہم کو بچنا چاہیئے — ہو از دل ان کو مبارک ہم کو تقوی چاہیئے

حکیم برہم گورکھپوری اپنے زمانہ کے ایک ادیب اور معتدل روش اخبار نویس تھے۔ اس جوش و خروش کی فضا میں ان کا ہفتہ وار اخبار مشرق گورکھپور اپنی نرم اور ٹھنڈی پالیسی کے لئے بدنام تھا۔

(۶) نئی روشنی کا ہوا تیل کم — حکومت نے اس سے کیا میل کم

۱؎ آیہ قرآنی الیوم اکملت لکم دینکم ۲؎ اسی آیۂ قرآنی کا دوسرا ٹکڑا واتممت علیکم نعمتی۔ ۳؎ آیہ قرآنی واملی لہم ان کیدی متین

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے　　سہاسی کمیٹی میں چل جائیے
ادھر مولوی کمیٹی میں تھے　　نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
اسی میل کا آج کل ہے ظہور　　خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

حضرت اکبر کے نزدیک بڑا فرق نان کو آپریشن اور اپنی کوآپریشن کے درمیان تھا۔ یہ حکیم شاعر تقوی کے حق میں تھا۔ اور ہنگامہ آرائی سے بیزار ان کو یہاں ہولی کو آپریشن کھلے تیار۔ تم ٹوپکی کو آپریشن میں ہو مست۔

وہ دلاتا ہے دل دیندار کو تقوی کی یاد　　اور اپنی کو آپریشن ہے مگر شر و فساد

لفظی صنوبروں کے پھول اور بیلیں کاغذ کاٹ کاٹ کر بناتے لیکن تخلیق کا کمال یہ تھا کہ ان کاغذی پھولوں میں بھی خوشبوئیں معنویت پیدا کر دیتے۔

انعام اگر چاہے تو دام سے ملئے　　آرام اگر چاہے تو دام سے ملئے
دنیا کا وہ حاصل ہے تو یہ دین کا حاصل　　اکبر کا قلم صنعت لفظی میں ہے کامل

ایک نظم گویا اس وقت ایک ترک موالاتی خلافتی کی زبان سے ہے۔ واپسی زور و شور کے ساتھ صاحبانہ زندگی سے ہند و تمدن اور اسلامی تہذیب کی طرف ہو رہی تھی۔

ہر چند ہوئے جناب واپس　　عہدہ واپس خطاب واپس
غصے کو کروں میں ضبط تا چند　　واپس پتلون لاد تہ بند
بیوی کا بھی جذبہ اب ڈھیلی گی　　واپس بے پردگی کریں گی
دیکھوں گا لوں کو کیوں صفاچٹ　　واپس لوں گا ریش جھٹ پٹ
بہتر ہے نہ دیکھو پیش یا پس　　اللہ کو کرو جان واپس

ہوگی وہی دلنواز اپنی   واپس لوں گا نماز اپنی

آگے موٹر سے بڑھ رہے ہیں   لالہ پھر رتھ پر چڑھ رہے ہیں

"ہنٹر کمیشن کس کو کہوں گا یاد آئے گا اسی وقت تازہ نام بچہ بچہ
کی زبان پر تھا۔ جلیان والا باغ (امرتسر) میں ڈائر نامی ایک انگریز فوجی
افسر نے ہندوستانیوں کے ایک مجمع عظیم پر بے تحاشہ گولیاں برسا دی تھیں
اس پر ملک بھر میں اک آگ لگ گئی۔ آخر ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھانا پڑا
جس کے صدر ایک برطانوی بیرسٹر لارڈ ہنٹر تھے اور اخبارات میں
مہینوں اس کے خوب چرچے رہے۔ اس کی جھلک اس آئینہ میں دیکھئے ؎

پالیسی جھگڑے چھوڑو   ان باتوں سے منہ موڑو

کیسے ڈائر کیسے ہنٹر   لاؤ ساغر لاؤ کنٹر

حضرت اکبر گاندھی جی کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ ان کی تحقیق
حکومت خواہ انگریزی ہو یا گاندھوی۔ تحریک بہرحال اسلامیت کو ضرر
ہی پہونچتا ہے ؎

آگے تمہارے رنگ کے کسی کا نہیں جما   جے ہو تمہاری اے مرے گاندھی مہاتما

لینے کو تم نہیں ہو گورنمنٹ کی مدد   جو زن کو کیا ضرور پہ پرمٹ کی مدد

سیاسیات کے چکر اور مدوجزر عجیب عجیب ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وائسرے
لارڈ ریڈنگ کا اشارہ پاکر گاندھی جی سے ان سے ملنے شملہ گئے اور
واپسی میں بیان بہت نرم دیا۔ ملاقات مالوی جی کے ذریعہ سے طے
ہوئی تھی عام خیال یہی پھیلا ہوا تھا کہ برطانوی سیاست کامیاب
رہی اور گاندھی جی توڑ لئے گئے۔ ادھر افغانستان کا ہوا زبردست تھا
اور ہندوؤں کو ڈرایا جارہا تھا۔ کہ خلافتی مسلمان افغانستان کی مدد سے

ہندوستان پر قابض و متصرف ہو جائیں گے۔ یہ ہمارے منتظر کلام اکبری عینک سے دیکھیے ؎

(۱) تل ابا ادھر الہ اوٹھا دکھائیں — ادھر لاٹ صاحب انگوٹھا دکھائیں
یہ انگریز بزالوں کا ہے کل طریق — نہیں بنتے صاحب کو اس میں سلیق

(۲) ان کی منزل کے مسافر ہو گئے — دیکھیے شملہ پر حاضر ہو گئے
لاٹ صاحب نے بہت اچھا کیا — صوت کو بھی ریشمی لچھا کیا
کچھ ملائم طبع گاندھی ہو گئے — اب نسیم صبح آندھی ہو گئے
شیخ جی تم کو مبارک روم والے — ہم تو کہتے ہیں کہ گاندھی جی کی جے
فرق ظاہر کلئے و دلدل کا ہے — وحشت افزا ہم میں بل کا بل کا ہے

(۳) حضرت گاندھی مجرے ایں شملہ پر نور سے — وا ہسی موسیٰ کی یاد آتی ہے کوہ طور سے
مستہر اخبار ہیں کر دیں ای مضمون کو وچ — اور ہندوؤں کو بھی حاصل ہونے والا ہے عروج
مسٹر گوچ اس وقت یو پی گورنمنٹ کے چیف سکریٹری تھے

پہلے شعر کا طنز یہ مفہوم یہ ہے کہ گاندھی جی ایسے تمغے سے لیکر شملہ سے آئے ہیں کہ گویا حضرت موسیٰ کلیم اپنی قوم کے لئے خدائی نسخہ شفا لیکر طور سے آئے ہیں۔

(۴) کمزور نہیں ہیں لاٹ صاحب — پالٹ سے نہیں ہے زیر غائب
لیکن اس پالیسی کو دیکھو — گر سے جو مرے تو زہر کیوں دو
صد شکر کہ کام کر گیا گڑ — بابو لوٹے تھے بھر گئے جڑ ؎[۲]

---

[۱] ابھی بہت کا لطف جب آئے گا جب گاندھی جی کے چرخہ اور کھدر کی اہمیت ذہن کے سامنے ہو۔ [۲] عام خیال بہکا کر ہندوؤں نے سرکار انگریزی سے مصالحت کر لی ہے

اظہار جوش طبع یہ وقت اپنا کھو چکے — اونگھے جناب شیخ بھی گاندھی بھی سو چکے

پنڈت سے کہو الگ بیچ میں پڑ کر تو کیا کریں — کابل سے بل سے گائے جو جھگڑے تو کیا کریں

صاحب کا بھی بھلا ہو کہ اس سمجھا دیا — پنڈت کا بھی بھلا ہو کرشمہ دکھا دیا[۵۱]

ایک دعا یہاں کلوکی زبان سے مانگی ہے اور اس وقت کی صاحب زدگی اور صاحب پرستی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

اے خدا مجھ کو کر دے صاحب لوگ — دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ

میرا قالب ہو قالب مغربی — بھول جاؤں زبان بھی اپنی

رنگ چہرہ کا میرے جائے بدل — کر دوں ایجاد میں بھی توپ و رائفل

سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں — سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

وقت کی ہندو مسلم ذہنیت کو یوں تحلیل کر کے دکھایا ہے ؎

جوں ہی مالوی اور شوکت میاں — لگے کرنے آپس میں سرگوشیاں

وہ بولے کہ کابل سے ہو گا گزند — کریں گے ہم انگریزی کو پسند

یہ بولے کہ ہندو کا ہوگا جو رول — ہم انگریزی کو کریں گے قبول

نہ تھا ان کے آپس میں کچھ اس سے نبج — یہ پڑھنے لگے ہو گئے وہ نغمہ سنج

کریما بہ بخشائے برحال ما — کہ ہستم اسیر کمند ہوا

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب سیورے کا نفرنس کے موقع پر مصالحت کی طرح پڑی اور فتح مندوں نے اپنی حسب مرضی خوب قید

---

[۵۱] پنڈت سے اشارہ برباد وقت کے نامور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ ہے۔

باندھی گئی ہے۔ اکبر کی نگاہ دوررس نے اس وقت بھی بہت کچھ دیکھ لیا تھا اور زبان سے یہ کہہ دیا تھا ؎

گورانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ انکو دیں گی نہیں
نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں بدلیں گی نہیں

ذروں کو تغیر ہے ہردم ادراک ہو جس کو خواہ نہ ہو
ضائع ہے نظر تری اکبر جب پیش نظر اللہ نہ ہو

امام ابوحنیفہ کا قافیہ اس سے قبل کبھی کسی نے کیوں باندھا ہوگا ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت
کالج سے امام ابوحنیفہ رخصت
صاحب سے سنی ہے اب قیامت کی خبر
قسطنطیہ سے خلیفہ رخصت

قرب قیامت کی پیش گوئیوں میں یہ مضمون آیا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت قسطنطنیہ میں باقی نہ رہے گی

علی برادران کی جد وجہد کے منکر نہ تھے۔ داد بھی دیتے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی پیام معرذت بھی پہونچاتے جاتے ہیں ؎

(۱) صاحب سے رکے تو راحتوں کو ترسے
شوکت سے اگر پھرے تو لعنت برسے
بہتر ہے کہ پڑ رہے توکل بہ خدا
باہر رکھے قدم نہ اپنے گھر سے

(۲) دشوار ہے مستحق آزر ہونا
کچھ سہل نہیں علی برادر ہونا
ہاں سب یہ دعا کریں کہ ان بندوں کو
آسان ہو پیر و پیمبر ہونا

اس وقت ملک کا شعور سیاسی جس درجہ تک پہونچ چکا تھا۔ اس کا صحیح نقشہ ان صفحات کے اندر موجود ہے کہتے ہیں

کیسے اگر ریل کی پٹری اکھاڑ دیں
ارشاد ہو اگر کوئی بنگلہ اجاڑ دیں
دفتر میں کاغذات جو ہیں ان کو پھاڑ دیں
دو ایک جو پہرے والے ہوں ان کو پچھاڑ دیں

لیکن نتیجہ کیا وہی فیر اور بھاگم بھاگ　　ہنر کا غم وہی وہی جلسہ پراگ[1]

کام کی بات کبھی مسدس کی لے میں الاپتے ہیں ؎

اے بھائیو دل میں ہے تمہارے یہ ٹھنی کیا۔
سمجھا کہیں شکوہ بہ تباہ و شدن کیا

بگڑی بھی کچھ ان کی تو کھو نہی ابھی کیا
بے فائدہ تم کر رہے جو لائے زنی کیا

بس صبر کرو طاعت و تقوی میں گذار دو
دیکھو سر تسلیم کو خم، حق کو پکار دو

اور کہیں نغمہ کو غزل کی دھن پر سناتے ہیں اور ساتھ ہی ظرافت کا ساز بھی چھیڑ جاتے ہیں۔

اتنا ہی گذارش کرنا ہے ہر ایک کو آخر ملے ہے
ایشور کو خوشی تو پن میں ہے شیطان ہی ہوگا پاپ سے خوش

بابو تو پرکرتی کے اندر ہیں اور ہندو تو مندر میں
بھگوان نے جس کو جپا کیا وہ جاپ سے خوش یہ جاپ سے خوش

عیسیٰ نے دل روشن کیا اور تم نے فقط انجن لیا
کہتے ہو کہ وہ تھے باپ سے خوش اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش

ہر خلق کی حالت جانچوں گا تو قد کی بلندی دیکھ کر
ہے یہ تو نگاہ اپنی اپنی ہیں وزن سے خوش اور ناپ سے خوش

---

[1] پراگ الہ آباد کا پرانا اور ہندوانہ نام ہے الہ آباد میں ایک احتجاجی جلسہ بڑے زوروں کا ہوا تھا۔

شروع ۲۰ء میں جب مولانا محمد علی رئیس وفد ہو کر خلافت کمیٹی کی طرف سے برطانیہ و فرانس کو گئے تو شریک وفد مولانا سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے۔ حضرت اکبر کو ایک عالم دین کی سیاست میں شرکت کچھ زیادہ پسند نہ آئی ایک لطیف و مہذب انداز میں تعریض بھی ادھر کر گئے ہیں۔

سلیمان کی بات اچھی نہیں ہے — کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بے شک کھنچے — مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں — خدا ان کو ہر دل سے کر دے غنی

دوسرے شعر میں شراب کے ضلعوں میں کھنچنا اور چائے کے ضلع میں گاڑھی چھننا کیا خوب ہے۔ ایک اور چھوٹے قطعہ کو شروع تو اپنے دانت کی تکلیف سے کر رہا۔ لیکن معاً رخ اپنے پیام اور دینی تعلیم کی طرف پھیر دیا ہے۔ مضمون کے اندر چاہے رقت ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن انداز بیان کی ندرت و لطافت بہر حال آپ کے ہونٹوں پر ہنسی لا کر رہے گی۔

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے — وہی مازو[1] ہی کا فور چلا جاتا ہے
ڈارون کے اسی لکچر کا سبق ہے اب تک — وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
برق کے طب سے آنکھوں کو بچائے اللہ — روشنی آتی ہے نور چلا جاتا ہے
شیخ صاحب کی کمر جھک گئی پر دل نہ جھکا — آج تک شوق سقنقور[2] چلا جاتا ہے

دیوان مطبوعہ میں "چلا جاتا ہے" کہ بجائے دو جگہ "چلا آتا ہے" اور سقنقور کا املا مسخ ہو کر چھپا ہے۔ اور یہ صرف ایک ہلکا نمونہ ہے کتاب کی بے شمار اغلاط طبع کا۔

گاندھی جی کی تحریکات جون ۱۹ء تا سنہ ۲۱ء اور گاندھیات پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ایک مستقل مجموعہ گاندھی نامہ کے نام سے تیار ہو گیا جولائی سنہ ۲۱ء میں جب آخری بار راقم اثم کو شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔

---

[1] مازو کافور۔ امراض دندان کی مشہور دوائیں ہیں [2] ماہی سقنقور ضعف مردمی کی مشہور دوا ہے

ارشاد فرمایا تھا کہ اس مجموعے کے موافق و مخالف ہر قسم کے خیالات نظم کر دئے ہیں۔ اس دیوان میں فرماتے ہیں ؎

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے   شاہنامہ ہو چکا اب دورِ گاندھی نامہ ہے

افسوس ہے کہ یہ اشعار دیوان بھر میں متفرق و منتشر ملتے ہیں کہیں ایک جگہ مرتب نہیں ملتے۔ ایک حد تک انتشار بے ترتیبی حضرت اکبر کے تینوں دیوانوں میں بھی موجود ہے۔ اور اس کی شکایت راقم اثم حضرت سے ان کے سامنے بھی کہہ چکا تھا۔ لیکن اس دیوان میں تو یہ بے ترتیبی بہت ہی نمایاں ہے۔ اور پڑھنے والے کو کھل جاتی ہے۔ اس مجموعہ کے بہت سے شعر پہلے گذر چکے ہیں اور کچھ آرہے ہیں۔ لیکن الگ کرکے اور کسی خاص عنوان کے ماتحت نہیں۔ بلکہ سابق کی طرح دوسرے مضامین کے ساتھ ملے جلے اور گڈمڈ۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کا شملہ جاکر وائسرائے سے ملنے کا ذکر دو تین بار آچکا ہے۔ اکبر صاحب نے اس بارپابی کو معاف نہیں کیا جب ذکر آتا ہے تو تعریض ہی کے لہجہ میں کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس تعریض میں بھی لطافت تلخی پر غالب ہے ؎

ملا کرتے تھے جو مضمون محو ہو کر گاندھی سے
خدا جانے کدھر دوڑ گئے شملہ کی آندھی سے

گاندھی جی کی یہ رسائی پنڈت مدن موہن مالوی کے مشورہ اور توسط سے ہوئی تھی شاعر اسے کسی طرح بھولنا نہیں چاہتا۔

گاندھی نے مان لی ہے مدن موہنی صلاح
ہندی تو تھے ہی اب مدنی بھی وہ ہو گئے

ایک ہندی کو اس طرح کی بات میں "مدنی" اکبر ہی کی ذہانت بنا

سکتی تھی۔

برطانیہ کے زبردست وزیر اعظم اس وقت لائڈ جارج تھے اکبر کے دیوان میں یہ قافیہ بن کر حاضر ہے۔

یہی مرضی خدا کی تھی ہم ان کے چارج میں آئے   سر تسلیم خم ہے مزاج جارج میں آئے

صاحب نے جتنے حقوق اہل ہند کو دئے تھے اکبر کی نظر میں اس کی وقعت کاغذی یا لفظی سے زیادہ نہیں۔ اہل ہند کو آزادی صرف کہنے کو ملی تھی ے

فیصلا اچھا ہے قانون اس سے کیوں ناخوش ہے
آپ جو چاہیں کریں بندہ جو چاہے لکھے

علی برادران کا وطن رام پور تھا۔ یہ یاد کر لیجئے اور اس کے بعد پڑھیئے۔

بھائی گاندھی کا نہایت ہی مقدس کام ہے
رام پوری ساتھ ہیں اور رام ہی کا نام ہے

رعایت لفظی کے تو بادشاہ ہی تھے۔ کہیں اس صفت سے معنی معنی آفرینی کا کام لیا ہے۔

سر گاندھی کا اڑائے سے گورنمنٹ ڈری   شور ہر سمت اٹھے گا کہ آندھی آندھی

لفظ گاندھی کا سر (صرف گ) جدا کر دیجئے لفظ آندھی رہ جائیگا

صاحب اپنا اصل حریف تو مسلمان ہی کو سمجھ رہے تھے۔ ہندوؤں سے تو اس درجہ بن دتھی بلکہ ان میں تو بہت کچھ قدر مشترک تھا۔ اس مضمون اکبر نے بار بار باندھا ہے۔ ے

(۱) کلیسا کے مقابل آج مشکل الجھنا ہے   کہ غیر و دلبر بھی اس کو منظور ہے مجھ سے تو اپنا ہے

(۲) دینی عدو کے سامنے گاندھی کی چل گئی، تہمد بیر فیر ہو گئے دھوتی سنبھل گئی
(۳) تیغ زبان کی دیکھو ہر سو ہر ہنگی ہے بابو کے حوصلہ میں صاحب کی دل لگی ہے
(۴) گاندھی سے کیوں ہو وحشت باطن سے مسٹری ہے
شوکت سے کیوں نہ کھٹکیں ان کی تو ہسٹری ہے

گاندھی جی کی تحریکات سنہ ۱۹ء سے شروع ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کا زمانہ سنہ ۱۸ء کے آخر کا زمانہ ہے شاعر ان دونوں واقعات میں بھی ربط محسوس کرتا ہے۔

ظلمت ٹھیک رہی ہے اس دور میں فلک کے تو نکلیں جھپکیں دیکھیں شیطان کی چمک سے
جرمن کے بعد گاندھی، پالیسی کی آندھی نادان سمجھ نہ اس کو جس نے کمر نہ باندھی
بہتوں نے ہمت کرلی تھی لیکن بہتوں نے کاندھا بھی ڈال دیا تھا

اکبر کے تیرہ کی نگاہ میں ؎

انڈیا نے کمر تو باندھی ہے کوئی شوکت ہے کوئی گاندھی ہے
لیکن اب بھی بہت سے ہیں اڑیں صرف لپٹن ہے اور گاندھی ہے

تحریک کی رو میں جیسا کہ ہر تحریک کے شباب کے وقت ہوتا ہے خدا جانے کتنا پیتل کتنا سونا دکھلائی دینے لگا۔ اور ہر بلند بانگ نعرہ انا الحق کے لگانے لگا ؎

گاندھی تو ہمارا بھولا ہے اور شیخ نے بدلا چولا ہے
دیکھو تو خدا کیا کرتا ہے صاحب نے بھی دفتر کھولا ہے

آنر کی پہیلی بوجھی ہے ہر ایک کو جھوٹی سوجھی ہے
جو چوکر تھا وہ سوجی ہے جو ماشہ تھا وہ تولہ ہے

ان جھٹکیوں کے ساتھ وہ بات بھی ابھی کہے چلے جاتے ہیں ؎

حکام سے نہ ربط نہ گاندھی سے ربط ہے

اکبر کو صرف نظم حوادث کا ضبط ہے

ہنستے نہیں وہ دیکھ کے اس کودو چاند کو

دل میں تو قہقہے ہیں مگر لب پر ضبط ہے ۔

توحید، عبرت و فنا ہیر خاص الخاص موضوع آخر عمر میں ان کی گفتگو کی طرح ان کی شاعری کی بھی تھے ، ہنساتے ، گدگداتے ۔ جب بیچ ایک بات بیچ میں ایسی کہہ دیتے کہ سننے والا آہ کہہ کر کلیجہ تھام کے رہ جاتا ہے ۔

(۱) تجلی مشرق کی اچھی تھی مغرب کی تعلی سے
وہ ذوق بیخودی اچھا تھا اس مہلک ترقی سے

(۲) فنا پذیر کرشموں سے کیا ہو دل راضی
نگاہ پیر نہ جھکی تھی کہ ہو گئے راضی

(۳) آئین طراز یاں ہوں کہاں تک شعور کی
کچھ حد نہیں ہے وسعت شان ظہور کی

(۴) جو رہتا ہے بھرے ہیں اہل دل رونے ہوئے
جائے حیرت ہے یہ بات اللہ کے ہوتے ہوئے

(۵) مدد فرد سے کچھ اسی انجمن میں نہ مل سکی
نگاہ اٹھ نہ سکی اور زبان ہل نہ سکی

(۶) شگفتہ ہو کے قیام اپنا چاہتی تھی کلی
مگر سوائے فنا آفرینی کے کچھ نہ ملی

(۷) اجل بولی کہ بس اب غرض اب تجھے خاموش رہنا ہے
بہت کہتا رہا بندہ ابھی کچھ اور کہنا ہے

(۸) دل شکستہ میں اک ساز جاں نواز بھی ہے
لرز رہا ہوں جس سے اسی پہ ناز بھی ہے

(۹) خرد پوچھتی ہے یہ کیا ہو رہا ہے
صدائے دل ہے خدا ہو رہا ہے [1]

(۱۰) نہ بحثوں پر لپکنا ہے دلیلوں کا جھگڑا ہے
زبان تھم رہے اور لذت اسمائے حسنا ہے

---

[1] اس وجد آفریں شعر کا ذکر پہلے گذر چکا ہے ۔

(۱) کیا بتادوں سخن ہوش ربا کے معنی — خود بخود کے وہی معنی جو خدا کے معنی

(۲) یہ مصرعہ مرے ہوش کھودیتا ہے — وہی تھا وہی ہے وہی ہو رہا ہے

(۳) یہ دعویٰ ہے مرا اس پر مرے دل کی گواہی ہے

ہوا جو کچھ جو ہوتا ہے جو ہوگا سب خدا ہی ہے

سب شعر اس طرح کے مزیدار۔ اگر دیوان سے کال کال کر پیش ہوتے رہیں تو شاید کچھ کم پورا دیوان ہی نہ نقل ہو جائے۔ اور تبصرہ کے بعد اصل دیوان کے مطالعہ کی ضرورت ہی نہ رہے

لیکن دیوان کی جان کہنا چاہیئے کہ وہ اشعار ہیں جن میں حضرت اکبر نے اپنے سہل ممتنع انداز میں شریعت و طریقت کے فرق کو بتایا ہے اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھایا ہے۔ بحث نازک اور بڑے بڑے معرکے اس میدان میں صوفی اور مولوی کے درمیان رہ چکے ہیں آج سے نہیں ہوئے تو بیشتر سے۔ یہ کمال اکبر کا ہے کہ افراط و تفریط سے بچ کر اور اہل بدعات و زاہد خشک، دونوں کے رنگ سے الگ ہو کر ایک ایسی کھری اور پکی بات اور وہ بھی ایک چٹکلے کی طرح بہترین لطیف انداز میں کہہ جاتے ہیں جو ملا اور صوفی دونوں کو لگ جاتی ہے۔ یہ دونوں ہنسی خوشی گلے ملوا دیتے ہیں یہ حقائق و معارف بلکل سچلکی عام فہم زبان میں نمبر وار ملاحظہ ہوں ؎

یہی الفاظ کہہ کر خفتہ کو جگاتا ہے — شریعت سر جھکاتا ہے طریقت دل لگاتا ہے

اسلام و ایمان کی تفسیر اس سے دلچسپ تر اور کیا ہوگی۔ پھر فرماتے ہیں کہ عبد و معبود کے باہمی تعلق پر نظر کرنے کی صورتیں دو ہیں ایک یہ کہ اصلی زور معبود کی معبودیت پر ہو۔ دوسری یہ کہ عبد کی عبدیت پر ہو۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ خربوزہ چھری پر گرا تو اور

چھری خربوزہ پر گری تو لیکن صورتیں تو بہر حال مختلف ہیں۔

ہو شرع یا طریقت پر ایک حق نما ہے ‌ ‌ ‌ ‌ واں ہے خدا کا بندہ، بندہ کا یاں خدا ہے

احکام خدا اور رسول کی سیدھی سادی تعمیل ہوتی چلی جائے بس شریعت کا منشا پورا ہو گیا۔ اور جس وقت سے دل بھی شریک ہو گیا۔ اس کا نام تصوف پڑ گیا۔ رسوم تقریبات سے اسے کوئی تعلق نہیں ؎

نہ صورت کا تصنع ہے نہ رسموں کا تکلف ہے ‌ ‌ ‌ ‌ شریعت کی بہ دل تعمیل ہو بس یہ تصوف ہے

صورت اور معانی دونوں اپنی اپنی جگہ پوری اہمیت رکھتے ہیں اور رسول کے واقعات زندگی خود ان دونوں حیثیتوں کے پورے جامع ہیں ارشاد ہے اور کتنے لطیف و لذیذ انداز میں ارشاد ہے ؎

شریعت میں ملا ہے صورت فتح بدر ‌ ‌ ‌ ‌ طریقت میں ملا ہے معنی شق صدر

نبوت کے اندر ہیں دونوں رنگ ‌ ‌ ‌ ‌ عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

ایک جگہ کمال کر دیا ہے صرف ایک مختصر ہلکے پھلکے نقطے سے شریعت و طریقت کا فرق واضح کر دیا ہے ؎

ادھر دیکھو اے طالبان معنی ‌ ‌ ‌ ‌ یہ مے جوش زن ہے مرے دل کے خم میں

شریعت طریقت کو کیا پوچھتے ہو ‌ ‌ ‌ ‌ شریعت ہے تم پر طریقت ہے تم میں

تبصرہ جو کوشش اختصار کے باوجود پھیلتا چلا گیا اب ختم ہونے کو آیا۔ لیکن خاتمہ سے قبل تین چیزیں ضرور قابل ملاحظہ ہوں ایک غزل ایک قطعہ اور ایک واقعاتی دو شعری نظمیں یہ تینوں اکبر کے آخری دور شاعری کی بہترین ترجمان یا صحیح ترین نمونے ہیں جنھوں نے اسے پڑھ لیا حضرت اکبر کے آخری روح کو پالیا۔ پہلے استادانہ غزل ملاحظہ ہو ؎

دلا زمیں تو کھود کر ہو گئی ہے کمپ میں شامل ‌ ‌ ‌ ‌ مگر ہاں آسماں کی کچھ پرانی شان ہے باقی ہے

(۲) بہت آراستہ ہم کو کیا تعلیم مغرب نے — بس اتنی ہی کسر سمجھو جو کچھ ایمان باقی ہے

(۳) سوا اس کے جو کچھ تھا ہو گیا سرکار میں داخل — خدا کا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے

(۴) ہوئے نیکی سے بیگانہ ترقی اس کو کہتے ہیں — فرشتے ہو گئے رخصت فقط شیطان باقی ہے

(۵) طبیعت میں ابھی تبدیلیوں سے سیری نہیں پاتا — یہ سچ ہے کٹ گئے ہیں پاؤں لیکن ران باقی ہے

اس کے بعد عارفانہ قطعہ کا آتا ہے ؎

ذہن شائق رہا ٹھکانے کا — رنگ بدلا کیا زمانہ کا

شوخئ عقل رہ گئی شک میں — کٹ گئی عمر مفت بک بک میں

کر دیا دل اِن و آن نے تباہ — مدد دے اے لا الٰہ الا اللہ

واقعاتی نظم پڑھنے سے قبل یہ یاد رکھیئے کہ ۲۰ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی دو مخالف کیمپوں میں سمجھے جاتے تھے۔ ایک کے یہاں تحریک خلافت و ترک موالات وغیرہ سے کامل بے تعلقی اور بے گانگی اور سارا زور اتباع احکام شریعت پر تھا۔ دوسرے کے یہاں گویا اصل تعلیم انہیں چیزوں کی تھی۔ اکبر کی نکتہ رس نگاہ اب ملاحظہ ہو کہ دونوں کے درمیان کیسا ربط پیدا کرتی ہے ؎

اشرفی ارشاد کھوٹا ہے نہ باری کا ہے حرف — صاف آ جائے سمجھ میں اگر رکھو تم عقل صرف

یعنی اسلامی کتابوں کی وہاں تحریر ہے — کفر کے حملوں سے بچنے کی یہاں تدبیر ہے

کلیات اکبر حصہ چہارم کے نام سے قیاس قدرتاً یہ ہوتا ہے کہ کلیات سوم کے بعد حضرت اکبر نے جو کچھ بھی کہا اس کے اندر آگیا ہو گا۔ لیکن ناشرین کی عنایت سے جہاں کلام کی ترتیب میں خرابیاں اور طباعت میں غلطیاں اس کثرت سے رہ گئی ہیں یہ بھی کیا ہے کہ خود کلام کا ایک بڑا حصہ اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گیا۔

حصہ چہارم مطبوعہ جیسا کچھ ہے اور اس میں کلام جتنا کچھ ہے اس پر سرسری نظر مجمع بزرگاں میں ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کچھ شعر تو بصرہ نگار کے حافظہ میں حضرت اکبر بالعبد کو ان کے صاحبزادے عشرت میاں مرحوم کی زبان سے سنے ہوئے اچھی طرح محفوظ ہیں اور کچھ کلام اس وقت چھپ بھی گیا تھا بہتر یہ ہو گا کہ یہ سب بھی اسی سلسلہ میں پیش نظر ہو جائے۔ کسے خبر کہ بعد کو اتنا بھی موقع ملے یا نہ ملے۔ علم سفینہ بیڑی کا حد تک پیش ہو چکا۔ اب آگے جو ہے خاصی حد تک علم سینہ ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا سید سلیمان ندوی، وفد خلافت میں شریک ہو کر یورپ گئے ہیں۔ اس وقت اکبر نے جو قطعہ کہا تھا ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی — وہ ندوی تھے اب ہو گئے لندنی

وہ اوپر کہیں پورا درج ہو چکا ہے۔ اس کے بعد جب خبر آئی کہ وفد پیرس گیا ہے تو اکبر صاحب اس خبر پر خاموش نہ رہ سکے اسی وقت ان کا یہ شعر اچھی طرح یاد ہے ؎

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پر — مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر

"پری" اور "سلیمان" کی مناسبت تو ظاہر ہی ہے اور رسنا یہ ہے کہ فرنچ زبان میں پیرس کا تلفظ بھی "س" کی آواز کے بغیر "پیری" ہی کے مشابہ ہے۔

مدتوں پہلے سرسید اور مذہبیات میں ان کے رفارم کا خاکہ اس قطعہ میں اڑا چکے تھے ؎

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات — افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے وہ مجھ سے "دین" کی اصلاح فرض ہے — میں چل دیا یہ کہہ کے آداب عرض ہے

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب صاحب ہندوستان میں سیاسی اصلاحوں

د[illegible] کی قسطوں پر قسطیں دے رہے تھے ۔ اور ہندوستانی انھی کھلونوں سے اپنا جی بہلا رہے تھے ۔ اور خوب زور و شور سے نعرۂ لبرل نعرے لگا رہے تھے ۔ یعنی اس وقت اکبر کو دل لگی سوجھی ۔ یہی بات تو بات دل کو گرمانے اور تڑپانے کے لئے لیکن اہل بزم سنتے کھلکھلا کر ہنس پڑتے

انگریز تو گو بچے ہیں سرافراز بھی ہیں   تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں
بالو کو بچا دیا جو چھاپا دے کر   اس سے یہ کھلا کہ دل لگی باز بھی ہیں

بازار کے بھوے چھاپے سے نلچتے کس نے نہیں دیکھے ہیں ؟ — لفظ کھلا، ظاہر ہے کہ یہاں ظاہر ہوا ۔ معلوم ہوا کے معنے میں ہے لیکن چھاپا، جن معنوں میں کے کام آتی ہے۔

ظرافت و مطائبت کے کوچہ میں قدم رکھ کر یہ کیونکر ممکن تھا کہ زبان فحش باہم فحشی سے بیشتر بچی رہے۔ شیخ سعدی ہیں تو اس راہ میں جتنا آگے بڑھ گئے ہمیں معلوم ہے حضرت اکبر اس کی آزادی کو بھی نہ گئے جو جی میں آیا کہہ نہ گئے تو کہہ ہی گئے ۔ کو ہمتی ان مکان اس قسم کے کلام چھپنے کے روادار نہ ہوتے ہوئے بلکہ یہ تو لمحہ نہ ہوتا کہ یہ کلام زیادہ لوگوں کے کان تک پہنچے ۔ زمانہ شاید ۱۹۱۲ء کا تھا جب ترکی پر بلقان کی ساری حکومتیں (بلغاریہ رومانیہ وغیرہ) یونان کے ساتھ ملکر یلغار کئے ہوئے تھیں اور ترک بیچارے برابر ہٹتے جاتے تھے ۔ یہاں تک کہ سالونیکا کے مورچہ پر انھوں نے جم کر مقابلہ کرنا شروع کر دیا ۔ اکبر کی ذہانت نے مضمون کی حقیقت کو ظرافت کا لباس پہنا کر پیش کیا ۔ فرماتے ہیں ۔ پہلا شعر یہ

مغرب کی دید بان بھی ترکوں حرم میں آ گئیں   ملحوظ رکھے دنیا اس رشتہ باہم کو

ترک غریب تو اپنے حرم یعنی کثرت ازدواج کے لئے ضرب المثل کی حد تک بدنام تھے ۔ اکبر انھیں بدنام کرنے والوں کے خاندان کی خاتون سے اس حرم کو آباد کرتے ہیں ۔ اور پھر دنیا کو بتلاتے جاتے ہیں کہ دیکھئے کہ اب ترکی اور یورپ کے

کے درمیان یہ رشتہ قائم ہوگیا اور اس کے بعد یہ فرماتے ہیں ؎

بچر کے اس پہ قبضہ کیسے دیں یہ ترک لوگ | سالونیکا ہے اب تو نشانوں کا تو ہم کو

ایسے کلام کا لطف غیر زبان والے نہیں لے سکتے کہ دوسری زبان میں اس کے ترجمے میں کچھ جان رہ سکتی ہے۔ یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں جو اردو میں الفاظ سالے، کے دوسرے مفہوم سے آشنا ہیں۔ جب یہ شعر اس زمانہ میں فرنگی کے کسی اخبار میں چھپا ہوا دیکھ کر حضرت کو داد لکھ بھیجی۔ جواب میں ناخوشی کا اظہار ہوا کہ آپ کو کون ایسے شعر سنا جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا "حضرت آپ اس لفظ میں رکاکت ہی کیا رہی۔ آپ نے تو پہلے شعر میں مستقل رشتہ جتا دیا۔

۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی تھی۔ کلکتہ کی مشہور رقاصہ گوہر بھی آئی۔ اور اس کو دیکھنے کے لئے خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے اور روایت مشہور تو یہ ہے کہ وہ خود حضرت اکبر سے ملنے آئی تھی۔ لیکن حضرت میاں مرحوم نے اس خبر کی قطعی تردید کی۔ حضرت اکبر نے اسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا اور بات کی بات میں یہ زبانوں پر چڑھ گیا۔

خوش نصیب کون یہاں تو نہیں گوہر کے سوا[لہ] | سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں جنگ عظیم شروع ہوئی ہے اور کئی مہینے تک برابر [illegible] بیشتر جرمنی کی خبریں آتی تھیں۔ تو خبروں کی عبارت ایسی ہوتی تھی کہ جیسے [illegible] بڑی بہادری سے پیچھے ہٹ گئی، ہوشمندی کا ہے۔ اس وقت نطق اکبر نے یوں جامہ شعر پہنا تھا۔

ہم سے سن لو خلاصۂ اخبار | ابتدا کرکے بڑھتے جاتے ہیں
ہر طرح سے شکست ہے روس | بجز اس کے کہ بڑھتے آتے ہیں

نومبر ۱۹۲۱ء (ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ) میں دس نامہ سہیل کے والد ماجد کا

لہ اس صفحہ کا حاشیہ صفحہ ۲۵۳ پر ملاحظہ ہو

انتقال مکہ معظمہ میں عین دوران حج قیام منیٰ کے زمانہ میں ہوگیا۔ ایک مدت کے بعد حضرت اکبر کی خدمت میں عرض کی کہ تاریخ وفات فرمادی جائے۔ جواب آیا کہ تاریخ گوئی میں مہارت نہیں تاہم مصرع تاریخ بے تکلف ذہن میں آگیا اسے قطعہ کردیا ملاحظہ ہو ؎

پیشوائے قوم والا مرتبت — شیخ عبدالقادر والا صفات

آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے — سمجھتے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات

جاہ و منصب میں گو وہ ممتاز تھے — کرتے تھے یاد خدا دن ہو کہ رات

ان کے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر — شغل ہی میں نکل آئی تاریخ وفات

۱۹۱۶ء میں مشہور مہاراجہ محمود آباد (سر علی محمد خاں مرحوم) نے راقم سطور سے کہا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا لکھوانے کو تیار ہوں کام شروع ہو تو میں ایک لاکھ دیتا ہوں۔ مولانا سلیمان ندوی بھی اس میں پیش پیش رہے اور ہم دونوں کی طرف سے متعدد اعلان اخبارات میں شائع ہوتے رہے حضرت اکبر اس پر کچھ فرما گئے ؎

خدائے جو عزت عطا کی ہو تم کو — تو ملت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو

اولوالعزمی راجہ صاحب کی سمجھو — مذاق سلیمان و ماجد کو دیکھو

اس زمانہ میں لکھنؤ میں شیعہ کالج نیا نیا قائم ہوا ہے مہاراجہ محمود آباد اس میں شریک نہ تھے۔ حضرت اکبر لکھنؤ آئے ایک روز راجہ صاحب کے ایک معتمد ملنے حاضر ہوئے۔ اور باتوں باتوں میں کہا "یہ تو علی گڈھ کے جواب میں ایک نئی مڑہ

لہ حاشیہ کا بقیہ صفحہ ۲۵۲ سے آگے ملاحظہ ہو اکبر کی شاید اسی دعا کا اثر تھا کہ گوہر آخری عمر میں شوہر دار ہوگئی تھیں۔

اینٹ کی مسجد بنانا ہوا۔ ہمارے سرکار اسے لئے تو اس میں شریک نہیں ہوئے حضرت اکبر نے جواب دیا کہ جی نہیں یہ علی گڑھ پر حملہ کیا ہوا جتنے کالج بنتے جائیں گے اور علی گڑھ کو تقویت ہوتی جائے گی۔ میرا شعر سنیئے ؎

سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا ۔۔۔ کالج ہے یہ کچھ امام باڑہ تو نہیں

۱۹۱۵ء میں الہ آباد حاضر ہوا۔ شب کو کھانے پر اور بھی دو چار صاحب مدعو تھے۔ کھانے کے بعد ذکر مسلمانوں کی موجودہ اخلاقی پستی بدنظمی وغیرہ کا نکلا ایک صاحب بولے جو کچھ بھی ہو بہر حال ہمارا حال فلاں فرقہ سے تو بہتر ہی ہے۔ ان کی اخلاقی حالت ہم سے کہیں زیادہ گندی ہے۔ حضرت اکبر نے فرمایا آپ نے بہت خوب بات کہی۔ جب ہی تو میرا شعر ہوا ہے ؎

گو لاکھ بے وقار ہوا مرزا کو غم نہیں ۔۔۔ کیا کم ہے یہ شرف کہ لفاقی سے کم نہیں

ایک اور رباعی دیکھئے بالکل رہی جاتی ہے۔ عین اس مقام پر آئی ؎

کستا جیسے بہ فکر جیفہ دوڑے ۔۔۔ یوں دہر پہ یہ بگری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت ۔۔۔ لٹھ لیکے امام ابو حنیفہ دوڑے

خوب یاد ہے کہ لکھنؤ کے ایک بالاخانے پر یہ رباعی حضرت اپنی زبان سے سنا کر خوب منع کر دیا تھا کہ دیکھئے اسے میری زندگی میں کہیں نہ چھاپ دیجئے گا مولانا صاحبان واقعی مجھ پر لٹھ لیکے دوڑ پڑیں گے۔ غرض اس طرح کے دس بیس نہیں سینکڑوں متفرق اشعار رہے جو اب تک کسی دیوان کا ز بنت بنے اور اب نہیں بنے تو آئندہ کیا توقع ہے۔ اگر اس لحاظ سے لیے وارثوں اور ناشروں کے معاملے میں سخت بدقسمت واقع ہوئے تھے۔ ٹھیک حضرت اقبال کے ضد یا یوں کہئے کہ اقبال جیسے اس معاملے میں اقبال مند نکلے ویسے ہی حضرت اکبر بد اقبال لیکن سب سے بڑا ظلم ان حضرات نے یہ کیا کہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۱ء کی کہی

ہوئی ایک مستقل نظم کو جو شریعت و طریقت کے باہمی تعلق کی تشریح میں ہے اب تک ان کے کسی دیوان میں جگہ نہ دی۔ حالانکہ یہ نظم ایک الگ رسالہ کی صورت میں آپ کی زندگی میں چھپ کر شائع ہوگئی تھی۔ یہ نظم ۲۱ شعروں کی ہے خدا بھلا کرے خواجہ حسن نظامی دہلوی کا کہ انھوں نے اسے "نظم الہام" کا عنوان دے کر اپنے دیباچے کے ساتھ صفر ۱۳۳۸ھ (نومبر ۱۹۱۹ء) میں حافظ عزیز احمد نقشبندی کے انڈین پریس دہلی سے چھاپ کر شائع کرایا۔ نظم ۱۸×۲۲ تقطیع کے ۳۲ صفحوں میں آئی ہے۔ اور ایک ایک شعر وصلی کی طرح صفحہ کے طول میں جلی قلم سے ایک ایک صفحہ پر لکھا گیا ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع پر لاجواب ہے۔ معنوی و ادبی حیثیت دونوں حیثیتوں سے اسے ذیل میں تمام و کمال درج کرکے اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے اور مسلمان ناظرین سے استدعا ہے کہ اپنے عارف باللہ پر فاتحہ خیر ضرور پڑھیں۔ اب نظم ملاحظہ ہو ؎

(۱) سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز — شریعت وضو ہے طریقت نماز

(۲) شریعت عبادت کی تعمیل ہے — طریقت عبادت کی تکمیل ہے [۱]

(۳) شریعت بحکم طریقت بہ دل — کہ معنی سے کر دے تجھے متصل

(۴) شریعت میں آثار راہ خدا — طریقت میں رفتار راہ خدا

(۵) طریقت شریعت سے صف بہ صف — وہ ہے موج دریا یہ دریا میں کف

(۶) شریعت سے ہے ظلمت کفر دور — طریقت میں فطرت کا ظاہر ہے نور

(۷) شریعت کرے گی بصیرت کو صاف — طریقت میں حسب مذاق انکشاف

(۸) شریعت تو ایک عام قانون ہے — طریقت کا ایک خاص مضمون ہے

(۹) شریعت میں لازم اطاعت ہوئی — طریقت میں شرط ارادت ہوئی

(۱۰) شریعت تو ہے نور دیدہ بیں — طریقت میں ہے روح کی دوربیں

(۱۱) شریعت ہے اک شمع محفل فروز — طریقت اک شعلہ وہم سوز

---

[۱] رسالہ میں یہ مصرع یوں چھپا ہے ع طریقت شریعت کی تعمیل ہے۔

(۱۲) شریعت ہے مہر سپہر ہدیٰ — طریقت کا رخ سوئے حب خدا

(۱۳) شریعت ہے جان اور طریقت نشاط — شریعت ہے منزل طریقت رباط

(۱۴) شریعت غذا ہے طریقت دوا — شریعت چمن ہے طریقت ہوا

(۱۵) شریعت عبادت ہے اللہ کی — طریقت محبت ہے اللہ کی

(۱۶) شریعت کی خدمت کا سب سے لگاؤ — طریقت کی لذت ہے من لیتا خو

(۱۷) شریعت میں ہے نار و جنت کا ڈنگ — طریقت میں وصل و فرقت کا رنگ

(۱۸) شریعت کتابوں کی ہے مستحل — طریقت میں ہے درس الواح دل

(۱۹) شریعت طریقت میں تو کیوں الجھو — وہ قرآن ہے اور یہ اس کی سمجھ

(۲۰) سخن سچیاں کو ہوں مری درست — مگر قول سعدی نہایت ہے چست

(۲۱) طریقت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(۲۲) محال است سعدی کہ راہ صفا — تواں یافت جز بر پئے مصطفٰے

(۲۳) شریعت نہ ہو اہل اس کا تو کیا اس کی قدر — خدا ہی کی مرضی سے ہے شرح صدر

(۲۴) شریعت میں دین اور ایمان ہے — طریقت میں تسکین و ایقان ہے

(۲۵) عبادت سے عزت شریعت میں ہے — عبادت کی لذت طریقت میں ہے

(۲۶) شریعت میں ہے تاکید ضبط نصوص — طریقت میں ذوق عمل با خلوص

(۲۷) طریقت قدم ہے راہ شریعت ہے راہ — شریعت زبان ہے طریقت نگاہ

(۲۸) شریعت در محفل مصطفٰے — طریقت عروج دل مصطفٰے

(۲۹) شریعت میں قیل و قال حبیب — طریقت میں ہے حسن و جمال حبیب[1]

(۳۰) شریعت میں ہے ارشاد عبدالقدرت — طریقت میں ہے یاد عبد القدرت

(۳۱) شریعت شکر ہے طریقت زبان — کہ مستی کی لذت چکھے تری زبان

---

[1] رسالہ میں مصرعہ چھپا ہوا ہے۔ طریقت میں محو جمال حبیب

(۱۲)

تعارف

میری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام　　ان کے مضبوط جہازوں کی مددگار ہے آگ

جس نے غزل کا یہ شعر اپنے عمر کے اوسط میں کہا تھا۔ اس کی شاعری کی عمر اکثر دین کی غمخواری اور ملت کی خدمت گذاری میں گذر گئی۔ لیکن خوش بخت اقبال کی سی اقبال مندی اکبر کہاں سے لا سکتا ہے۔ اکبر غریب کا نام اگر شہرت کی تابیوں نے اچھالا بھی تو صرف اسی حیثیت سے کہ ظریف لاجواب ہیں اور شوخ گوئی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ شعر کلیات اکبر حصہ اول کا ہے۔ جو ۱۹۰۹ء میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا۔ مگر جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ رنگ بھی نکھرتا گیا۔ کلیات اول اگر اس رنگ کے لحاظ سے نقش اول تھا تو کلیات سوم و دوم و چہارم کی نقش ثانی، اور نقش ثالث اور نقش رابع کہیے۔

اکبر غزل گوئی کی حیثیت سے بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ غزلیں انہوں نے خوب اور بہت خوب ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ میں بڑی کثرت سے بھی کہیں لیکن ان کے کلام کا اصل اور امتیازی رنگ عاشقانہ غزل سرائی نہیں بلکہ ع

خدا کی یاد کی پکارتا ہوں　　ہوا کرے ناخوشی بتوں کی

کی ضربیں لگاتا ہے۔ ذکر خفی کی ایک لطیف اور نادر صورت ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۳۰-۳۲ سال کی عمر میں جب ہوش کے سن کو پہنچے

نوٹ: ۱ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر جلد ۲۴ نمبر ۳ ۱۹۵۰ء

تو دیکھتے کیا ہیں گھر کے در و دیوار تک اقبال فرنگ کی صداؤں سے گونج رہے
ہیں۔ "صاحب" کا لایا ہوا اور پھیلایا ہوا تمدن ہے کہ اندر ہی اندر اپنے پنجے
جما چکا ہے۔ اور اسلامی یا نیم اسلامی تہذیب و معاشرت ہے کہ کچہری سے
بازار سے اسکولوں، دفتروں سے سب کہیں سے بیدخل ہو رہی ہے مٹی جا
رہی اور مٹائی جا رہی ہے۔ ماحول کی یہ گھٹا ٹوپ کی تاریکی دیکھ کر انہی ذلت
اور بے پناہ حسن ظرافت کو انھوں نے اس سے مقابلہ کے لئے وقف کر دیا۔ دوسروں
کے پاس سنجیدہ دلائل تھے۔ اور کتابوں کے پشتارے اکبر کی صفوں میں
سب سے بڑا حربہ طنز و ظرافت کا ہے کہیں انھوں نے ہلکے مزاح سے کام لیا
اور کہیں گہرا نشتر و تعریض کا دیا۔

دو فلک کا ماجرا آپ سے کریں بیاں — تفرقہ دیکھئے ذرا ہم پہ پڑے عجیب ڈل
جان سپرد ڈاکٹر و مال سپرد آنجناب — عقل سپرد ماسٹر روح سپرد ذار دل

انگریزی سیاست، انگریزی تہذیب معاشرت انگریزی علوم و
فنون سے مرعوبیت سب کی تصویر آخر کے دو مصرعوں میں آ گئی۔

ڈارون پر چوٹیں جا بجا ہیں۔ اور اس وقت ضرورت بھی اسی کی تھی۔
نظریہ ارتقا فضا پر چھایا ہوا تھا۔ ہندوستانی دل و دماغ اس سے بری طرح
مرعوب تھے۔

ڈارون کے اس کلو کا سبق ہے اب تک — وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
ڈارون صاحب حقیقت سے بہت دور تھے — میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

اکبر تعلیم برابر خود داری اور خود اعتمادی کی لائے جاتے ہیں ؎

ڈارونیوں کا چلا سلسلہ تیمور کے بعد — دیکھیں کس نسل کی جیت ہے لنگور کے بعد
شاگرد ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا — اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

دیوان بہ دیوان ایسے ہی لطیفوں سے بھرے ہوئے ہیں معاصرین پر رائے زنی خوب خوب کرتے گئے ہیں۔ تلمیحات کی پوری طرح سمجھنے کے لئے وقت کی شخصیتوں اور وقت کے حالات سے واقفیت ضروری ہے ۔

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں ہیں اور یہ زو میں ہیں

فارسی کا مشہور شعر یاد کر لیجئے ۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

شعر اکبر کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو ایک طرف بانئ خلافت مولانا شوکت علی مبلغ اسلام کی وضع قطع اور پرشور مجاہدانہ و فعال زندگی سے واقف ہوں اور دوسری طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی پر حکمت سیاسی زندگی سے۔ لیکن ظاہر و قالب کے اتنے شدید اختلاف کے باوجود درد ملت دونوں میں مشترک جب اسلام کے دونوں حصہ دار۔

تمدن فرنگ کے سلسلہ میں ایک بڑا فتنہ عورت کی بے حجابی کا ہے جس کا خوشنما نام عورت کی آزادی رکھا گیا ہے۔ ہر قسم کی عزت بلکہ عزت و عصمت کا خون اس آزادی کی آڑ میں جائز ہے۔ اکبر کی خاص توجہ اس حملہ کو روکنے پر رہی۔ اور ان کا شروع کا کہا ہوا قطعہ تو اردو میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

آئیں جو بے حجاب نظر بی بیاں اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

جانتے تھے کہ زمانہ کے اس رو کو کون روک سکتا ہے ۔

بحث میں آ گیا فلسفۂ شرم و حجاب دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

سمجھتے تھے کہ روک تھام کی کوششوں سے کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے ۔

بٹھائی جائیں گی پردے میں بی بیاں کب تک — بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کب تک

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی — تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

جو منہ دکھائی کی رسم پر ہے مصر ابلیس — تو منہ چھپائیں گی حوّا کی بیٹیاں کب تک

سنا کہ حضرت اکبر ہیں حامی پردہ — مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

لیکن اپنا والی کئے گئے جب تک دم میں دم رہا کچھ نہ کچھ کہتے ہی گئے کبھی یوں داد خوش نوائی دیتے ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

بہت کچھ اسی لئے ہیں کہہ گئے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کا کہا ہوا ایک پورا مجموعہ (گو وہ مجموعہ بہت ناقص ہے) عورت نامہ کے نام چھاپ دیا ہے مستقبل کا نقشہ فراست ایمانی کی مدد سے خوب دیکھ چکے تھے۔ ایک بڑی نظم میں پورا خاکہ کھینچ گئے ہیں۔ نمونہ کے دو چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح حاجب روئے صنم ہونگے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر — بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

ظرافت سے ہٹ کر سنجیدہ کلام میں بھی مذہب کی حمایت کا حق ادا کر گئے ہیں۔ اور جہل کا چلا ہوا اعتراض اسلامی جہاد پر ہے کہ اس کا ذکر کر کے کہتے ہیں ؎

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام — یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

جہاد، پردہ، طلاق، تعدد ازدواج وغیرہ متعدد اسلامی مسلکوں کی نصرت میں کلام کا اچھا خاصہ حصہ موجود ہے۔ کہیں کہیں کوئی کلامی مسئلہ بھی اپنے مخصوص رنگ میں حل کر گئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ نفس میں جو تمنا یا خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کہ کاوش یوں ہوتا یہ خود ہی ایک طرح کی دعا یا عرض حاجت ہے اور اس طرح کا شعور لاشعوری طور پر ایک قادر علی الاطلاق خدا کی ہستی کا اعتراف ہے ؎

مجبور ماننے پر ہے منکر کی طبع بھی
خواہش کو کیا سمجھتے ہو صورت دعا کی ہے

دو اور شعر حکمت و معرفت کے رنگ کے اس لاجواب غزل سن لیجئے ؎

رفتار اور سمت میں موج ہوا کی ہے
اے قصہ گوئے بدر ضرورت خدا کی ہے
جغرافیہ سے حال گورنمنٹ پوچھئے
ہم تو یہ جانتے ہیں خدا کی ہے

اور کبھی کہیں شریعت کے پکوان میں شاعری کی چاشنی کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیتے ہیں ؎

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
معنی یہ ہیں کہ کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

توحید عبرت و فنا کے مضامین اس کثرت سے اور اس خوبی کے بیان کئے ہیں کہ ان کا ایک حصہ بھی اگر نقل کر دیا ہو تو یہ تعارف نامہ جو درحقیقت سرسری سے بھی زیادہ سرسری ہے ایک مستقل مقالہ کی شکل اختیار کرنے لگے

راقم اثم کی سب سے پہلی حاضری دربار اکبری میں اپریل ۱۲ء میں ہوئی ادھر ۲۰ سال کی عمر کا طالب علم ادھر ۶۱ سال کا ایک بزرگ۔ نیازمندی کے یہ تعلقات بڑھتے گئے اور اس مخدوم کے وقت وفات تک قائم رہے ادھر سے عقیدت و تکریم تو کچھ واجبی سی ہی تھی۔ ادھر سے شفقت و کرم کی البتہ کوئی حد نہ تھی۔ ۹، ۱۰ برس کی مدت کچھ ایسی کم نہیں، بات کہتے لطف و انبساط کا زمانہ گذر گیا اور اپنی طرف

حسرتناک یاد چھوڑ گیا۔ حضرت اکبر بارہا اس دوران میں لکھنؤ میں تشریف لائے اور کبھی بار اس نیاز مند کو بھی الہ آباد یا پرتاپ گڈھ میں یاد فرمایا۔ اور خط وکتابت تو کثرت سے رہا کرتی تھی۔

حضرت اکبر کی نثر نگاری کے بھی استاد تھے۔ ہلکی پھلکی سلیس عبارت شستہ زبان اور عجیب و دلنشین انداز بیان۔ خط لکھتے تو معلوم ہوتا کہ سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ خطوط کے تین مجموعے چھپ بھی گئے ہیں جن میں سے ایک مجموعہ اس عاصی کے نام کے خطوط کا ہے۔ گفتگو بڑی ہی دلآویز فرماتے بڑی اچھوتی، اونچی، نیچی۔ دینی، دنیوی، علمی، سیاسی، شخصی سب ہی طرح کی باتیں مجلس میں چھڑ جاتیں۔ حضرت اکبر کا کمال تھا کہ موضوع کوئی سا بھی ہو اکثر تھوڑی دیر بعد گفتگو کا رخ توحید یا خدا کی طرف پھیر کر لے آتے۔ جوانی میں جو کچھ اور جیسے بھی رہے ہوں آخر عمر میں توحید و فنا کا خیال ہر دوسرے خیال پر غالب و حاکم بن گیا تھا اور کلام کی طرح گفتگو بھی اس سے لبریز رہتی تھی۔

ہنستے کم اور مسکراتے زیادہ تھے۔ نماز و تلاوت کے مشغلے گویا مقصد زندگی رہ گئے تھے۔ تلاوت کے دو وقت بندھے ہوئے تھے ایک بعد نماز فجر دوسرے نماز ظہر کبھی کبھی رات کو بھی موم بتیاں جلا کر قرآن مجید کھول کر بیٹھ جاتے اور بوڑھی اور تھکی ہوئی آنکھوں سے تلاوت کیا کرتے۔

عربی کی استعداد کچھ زیادہ نہ تھی کہتے تھے کہ جو کچھ عربی آئی وہ تلاوت قرآن کے طفیل میں آئی سنہ ۲۰ میں ایک روز پرتاپ گڈھ میں تنہائی میں مجھ سے فرمایا کہ یہ جو آپ میرے کلام کے اتنے گرویدہ ہیں تو اس میں بات کیا ہے، فارسی زبان کو سامنے رکھئے کتنے ذہین اور قابل شاعر اس نے پیدا کئے لیکن دنیا نے یاد ان میں سے دو ہی چار کو رکھا شیخ سعدی اور مولانا روم وغیرہ۔ ان کو جنہوں نے اپنے کو مٹا کر اپنے خدا کی یاد تازہ رکھنا چاہی۔ اسی حی و قیوم نے بھی انھیں زندگی بخش دی۔

(۱۳)

اکبر الہ آبادی

نئے لباس میں

مرے ہوئے لیکن نہ مرنے اکبر الہ آبادی کی یاد میں بزم اکبر کراچی میں قائم ہوئی ہے۔ اس نے کلیات کا نیا اڈیشن حال ہی میں شائع کیا ہے۔ نئی وضع نیا لباس، نئی سج دھج، نئی چھپ نئی تختی۔ اس حصہ کا پہلا اڈیشن ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا یہ نیا اڈیشن اس کے ۴۲ سال بعد نکل رہا ہے۔ اس کی ضخامت ۴۴۴ صفحات کی چھپائی اچھی، صاف روشن، کاغذ اچھا، جلد بھی یہ ساری خوبیاں ایک طرف لیکن دوسری طرف غلطیوں کی بھی کمی نہیں ـــ غلطیاں زیادہ تر کاتب، پروف ریڈر اور مصلح سنگ کی غفلتوں کا نتیجہ ہے اور اس کا بھی نتیجہ ہے کہ مرتب صاحبان مسودہ کی ترتیب و تہذیب پر اتنا التفات نہ کر سکے جتنے کا وہ مستحق تھا۔ اور یہ آخری کمی تو حضرت اکبر ہی کے زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ اچھے سے اچھا شاعر کے لئے بھی یہ ضروری نہیں کہ اپنے کلام کا وہ اچھا ایڈیٹر بھی ہو۔ پرانے ایڈیشنوں میں کچھ دیباچہ بھی مصنف کے قلم سے تھے، اس ایڈیشن میں انھیں غیر ضروری سمجھ کر[1] حذف

---

[1] صدق جدید مورخہ ۱۹ر اکتوبر، ۲۶ر اکتوبر، ۱۶ر نومبر ۱۹۵۱ء، ۱۵ر فروری ۱۹۵۲ء

کردیا گیا۔ حالانکہ ان سے شاعر کی شخصیت کے سمجھنے میں کسی حد تک تو مدد مل ہی جاتی
تھی۔ اور اس سے کہیں بڑھ کر تکلیف دہ وہ اختصار پڑھنے والے کے لئے ہے کہ زبردست
مضامین سرے سے غائب۔ ! بیسوی صدی کا ناظر تو منتظر متوقع انڈکس کا رہتا
ہے۔ توصیفی نوٹوں کا رہتا ہے۔ تعارفی تمہید کا رہتا ہے۔ خیر یہ سہارے الگ ہے
یہاں معمولی فہرست تک سے بخل کتاب لکھتے ہی طبیعت کو بیدا سبق مجاہدہ
کا صبر مل گیا۔!

اکبر کا سال پیدائش ۱۸۴۶ء ہے۔ شعر گوئی ۱۶ ہی ۱۷ سال کی عمر سے
شروع کردی تھی۔ اس کلیات میں کلام کل ۵۰ سال تک کی عمر کا آیا ہے۔ گویا صرف ۱۸۹۶ء
تک کا۔ انیسویں صدی کے ختم سے بھی چار سال قبل تک کا۔ اکبر کو ابھی تک
۲۵ سال کی اور مہلت جینے سینے کی باقی تھی۔ اور یہی زمانہ بحیثیت مجموعی ان کی بہترین
سخن گوئی کا ہے۔ اور کلام کا ابھی پختگی پر پہونچنا۔ تو اس سن میں ظاہر ہی ہے۔ لیکن
یہ ابتدائی اور درمیانی عمر کا کلام بھی ہرگز نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں اور بے قدری
کے معنی اگر بعد کا کلام اسی سے بھی بلند تر اور پاکیزہ تر نہ مل جاتا تو یہی کلیات
اول والا کلام آخری قدر و احترام کا مستحق تھا۔ آنکھوں میں لگانے کے قابل۔
سر پر رکھنے قابل۔

یہ کلیات دو بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ نسبۃً بڑا، غزلیات
کا ہے۔ ص۵ سے ۲۲۴ تک۔ دوسرے حصہ میں رباعیات قطعات، دیگر منظومات
ہیں ص۲۲۵ سے ۲۵۶ تک پہلے حصہ میں دور قائم کئے ہیں۔ شاعر کی عمر کے لحاظ
سے اور یہ بہت اچھا کیا تا کہ کلام کی ترقی درجہ بدرجہ ظاہر ہو رہی ہے۔ دور اول
میں ۱۶ سال کی عمر سے ۲۰ سال کی عمر تک کا کلام ہے۔ ص۲۵ دور دوم میں ۳۰
سے ۴۰ سال کی عمر تک کا کلام ہے۔ ص۵۱-۹۵ اور دور سوم میں ۴۰ سے ۵۰ سال

کی عمر تک کا۔ صفحہ ۹۹-۲۲۵ یہ دور وار تقسیم پرانے اڈیشنوں میں بھی تھی لیکن ترتیب میں فرق کر دیا گیا تھا۔ اور یہ بڑا فرق ہے۔ پہلے دور سوم شروع میں تھا اور دور اول آخر میں (شاید اس خیال سے کہ دور اول کا کلام کمزور رہا ہوگا) اب یہ ترتیب الٹ کر صحیح تاریخی ترتیب قائم کر دی گئی ہے۔ یعنی شروع کا کلام شروع میں، آخر کا آخر میں، اور درمیان کا درمیان میں۔ اب دور اول خود ۱۰ حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے ۱۷-۱۸ سال کی عمر کی غزلیں پھر ۱۹، ۲۰ سال کی پھر ۲۱ سال کی وقس علی ہذا ــــ بعض صاحبوں کا کہنا ہے کہ یہ سارا رطب و یابس کلام جمع کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ صرف ایک اچھا انتخاب چھاپ دینا کافی تھا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ یہ اچھا انتخاب کون کرے اور انتخاب کے اچھے ہونے کی ذمہ داری کون اپنے سر لے۔ غالب کی خوش نصیبی ہر شاعر کے حصہ میں کہاں سے آ سکتی ہے۔ کہ اس معیار سے اس دور زمانے کے دوسرے اہل ذوق بھی متفق ہوں۔ چہ جائیکہ ماحول بدل جانے کے بعد بھی! غالب تک کا کوئی بھولا بھٹکا شعر مستند دیوان سے باہر کا جب کہیں ادھر ادھر نظر پڑ جاتا ہے۔ تو جی چاہتا ہے لگتا ہے کہ اسے بھی مستند دیوان کے حاشیے پر یا بین السطور ہی۔ کہیں ٹانک ہی لیجئے! باقی یہ بالکل ظاہر ہے کہ کسی بھی شاعر کا کلام اول سے آخر تک ایک معیار اور ایک سطح کا ہو ہی نہیں سکتا۔ دگستاخی نہ ہو تو کلام اللہ تک کے درجہ، بلیغ، بلیغ تر بنا کے قائم کر دئے ہیں) امیر، داغ، جلال، جلیل، ریاض، حسرت سب اس آخری دور میں خوش گوئی و خوش فکری کا امام ہوئے ہیں۔ لیکن جب ان کے کلام کے بڑے صحیح مجموعے سامنے آتے ہیں تو عقیدت مندوں کے دلوں کو دھچکا ہی پہونچتا ہے۔ اور زبانوں پر بے اختیار آنے لگتا ہے کہ کاش اللہ نے فلاں فلاں جزو باقی رہتے اور فلاں فلاں نہ رہتے ــــ اکبر غریب بہرحال بشر و بشریت

کے سارے عارضوں میں گرفتار اس کلیہ سے مستثنیٰ کیونکر رہ سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن میں جما کر جو آگے چلیے تو انشاء اللہ کسی مایوسی سے دو چار نہ ہونا پڑے گا۔

۱۷-۱۸ سال کا سن بھی کوئی شاعری کا ہوتا ہے؟ حکیمانہ عارفانہ شاعری کو چھوڑیے۔ ادبی شعر میں ذوق کا بھی تو یہ زمانہ بچپن کا ہوتا ہے۔ اکثر کے ہم سن لڑکے اس سن میں لنگر لڑا رہے ہونگے یا چرخیوں پر ڈور لپیٹا رہے ہونگے اُن کے لڑکپن کو دیکھیے اور اس کلام کو ؎

جانبِ گیسو پھر کھنچا جاتا ہے دل — دیکھیے اب میرے سر کیا بلا لاتا ہے دل
ساتھ ساتھ اپنے جنازے کے یہ چلاتی تھی روح — ان کو مٹی میں ملانے کے لئے جاتا ہے دل (۲)
جو ابھی زندگانی کو حباب آب سمجھتے ہیں — نفس کی موج لب دریا سمجھتے ہیں
گواہی دیں گے روزِ حشر یہ سارے گناہوں کی — سمجھتا ہی نہیں لیکن مرے اعضا سمجھتے ہیں
یہی رخ ہے کہ جس پر پھول کا اطلاق ہوتا ہے — یہی آنکھیں ہیں جن کو نرگسِ شہلا کہتے ہیں
اسے ہم آخرت کہتے ہیں جو مشغولِ حق رکھے — خدا سے جو کرے غافل اسے دنیا سمجھتے ہیں
کس غضب کا ہے معاذ اللہ طولِ روزِ ہجر — حشر مجھ پر ہو گیا لیکن یہ ڈھلتا نہیں

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے گا، کتاب میں اگر عمر کی یہ تصریح درج نہ ہوتی تو کبھی بھی اس کلام کو ایک ۱۷ سال لڑکے کا سمجھ سکتے تھے؟

یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

پھر یہ استاد از پیش مصرعہ سنتا ہوں ضمن میں جو تری زمزمہ سنجی اور اس سن میں ان ان مضمونوں کا ورود و نزول اللہ اللہ ؎

بیخودی پردہ کثرت جو اٹھا دیتی ہے — ہر طرف جلوہ توحید دکھا دیتی ہے
نگہِ شوق سے کیونکر نہ گلوں کو دیکھوں — ان کی رنگت ترے عارض کا پتہ دیتی ہے
بو مٹتا ہوں میں جو بت سے مآلِ ہستی — راستہ گورِ غریباں کا بتا دیتی ہے

کشتہ ہوں مرگ حسیناں کی بیدردی کا — خاک میں چاند سی صورت کو ملا دیتی ہیں
کیا رہ رہ کے طبیعت مری گھبراتی ہے — موت آتی ہے شب ہجر نہ نیند آتی ہے
بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں — کوئی گذری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے (١٨٨١)

اور اسی عمر میں یہ معرکے کی غزل سو کر شعر والی جس کا ایک شعر بھی انتخاب سے باہر رہنے والا نہیں

کہیں دل ہوں کہیں ہوں باعث بیتابی دل — کہیں انداز بسمل ہوں کہیں ہوں ناز قاتل ہوں
کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شان معنی — کہیں ہوں محمل لیلی کہیں لیلائے محمل ہوں
کہیں عمر دو روزہ ہوں کہیں ہوں آرزو دل کی — کہیں گھٹنے کے لائق ہوں کہیں بڑھنے کے قابل ہوں
کہیں جوش اہل معنی کا کہیں ہوش اہل صورت کا — کہیں شور انا الحق ہوں کہیں دعوی باطل ہوں
کہیں ہوں صورت لیلی کہیں حال دل مجنوں — کہیں چھپنے کے لائق ہوں کہیں کھلنے کے قابل ہوں (١٨٨٢)

ستائیسویں سال میں پہلی مختصر غزل فارسی کی ملتی ہے۔ اور اٹھائیسویں سال کے تحت میں تین تین غزلیں فارسی کی نظر آتی ہیں جن میں خاصی رمی بڑی اور ٢٩ تا ٣٠ برس تک پہونچے تو یہ رنگ عام ہو چکا تھا۔

موجہ و طعنہ بیگانہ احباب ہوا — خوب رسوا ترے ہاتھوں دل بیتاب ہوا
ترے جلوے سے ہوا حسن ظہور ایجاد — نور تیرا سبب عالم اسباب ہوا
رہی ہر کام میں ہر وقت مسبب پہ نگاہ — اپنا منظر نہ کبھی عالم اسباب ہوا
یاں کی رنگینیاں ہیں عین دلیل غفلت — سرخی چشم سے پیدا اثر خواب ہوا (٨٣ء)

اس کے بعد جو دور آیا وہ اس رنگ کلام کی پختگی بھی ساتھ لایا ۔

رہا شہرہ عشق کا باب مجھے ڈر انھیں اپنے پرائے کا خوف و خطر
رہی دل میں ہی حسرتیں دونوں طرف جو ہی جا نہ سکا تو وہ آ نہ سکے (٨٤ء)
آپ کے شہرۂ رحمت نے تو ڈھایا ہے غضب — ایک عالم کو گنہگار بنا رکھا ہے تو (٨٧ء)

وہ نظر جو مجھ سے مل گئی تو بہار آفتیں ڈھا گئی — کہ حواس دشمن و غم و خرد بہانۂ تخریب صبر و قرار ہے

یہ نوید اوروں کو جا سنا ہم اسیر دام ہیں اے صبا — ہمیں کیا جو چمن پہ رنگ برسمت ہمیں کیا جو فصل بہار ہے

یہ عشق میں ہر غلط ترقی مرے دل کی — ہر دائے بڑھ جاتا ہے تجلی مرے دل کی

نظروں سے تری گر کے ہوا عشق دوبالا — ہوتی ہے تنزل میں ترقی مرے دل کی (۱۹۰۳ء)

۱۹۰۴ء میں کاسن یوں سے خلل بلوغ کا ہوتا ہے۔ پختگی کلام میں اب کیوں نہ آجاتی اس دور کے کلام رنگ تغزل اور مضامین معرفت دونوں ہی کے لحاظ سے قدرۃ ممتاز ہے۔

انتخاب میں آنے کے لیے پہلی ہی غزل محل رہی ہے۔ زمین "خدا میرا"، "پتا میرا"۔

مری حقیقت ہستی یہ مشت خاک نہیں — بجا ہے مجھ سے جو پوچھے گا کوئی پتہ میرا

اور مقطع ؎

غرور اچھا نہیں ہے تو مجھ کو نہ ہے اکبر — سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

دوسری غزل کا ایک ایک شعر پکار رہا ہے کہ یہ اکبر ہی کی زبان سے ادا ہو سکتا ہوں ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

یہ تو ذہن میں ہو ہی گا کہ حضرت سید کے سفینہ وار پرچے کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا۔ نمبر ۸ پر ایک بڑی سی غزل ۱۶ شعر کی ہے اس کے بعض شعروں کو میں نے حضرت اکبر کے صاحبزادے عشرت میاں کو ستار پر گنگناتے سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ خود حضرت اکبر کو ایک حد تک اسی پر ناز تھا۔ کعبہ کو اسے پہنچے

اپنے جوانوں کو یاد کرادیا تھا۔ اور ان کی زبان سے مدتوں اسے سنتا اور وجد کرتا رہا۔ ملاحظہ ہو سہ

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا ۔۔۔ میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا
شان محبوبی صانع کا نشان رکھا ہے یہ ۔۔۔ ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
دین سے اتنا الگ حد فنا سے اتنا قریب ۔۔۔ اس قدر دلچسپ پھر کیوں رنگ دنیا کر دیا

کیا مرے دل اک دل کو خوش کرنے پر قادر نہیں ۔۔۔ ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے فہم و خرد ہوش و تمیز ۔۔۔ خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا
شاہد بزم ازل اک نگاہ ناز سے ۔۔۔ عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا
شورشیں کا مزا رکھا سر فرہاد میں ۔۔۔ قیس کو دیوانہ انداز لیلا کر دیا
گردن پروانہ میں ڈال کمند شوق شمع ۔۔۔ رنگ گل کو دیدہ بلبل کا شیدا کر دیا
جس نے یہ سب کچھ کیا اکبر میں تم سے کیا کہوں ۔۔۔ اسی نے مجھ کو کیا کیا دل کو مرے کیا کر دیا

اور اس سے متصل ایک دو شعری مختصر نعتیہ غزل اپنے رنگ میں لاجواب سہ

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا ۔۔۔ دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ۔۔۔ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

راقم اثم نے ایک تفسیری مضمون سورہ الفرقان (پ ۱۹) کے آخری رکوع تبارک الذی جعل فی السماء الخ پر ہے۔ نعت و مدح صحابہ کا جامع عنوان مردوں کی مسیحائی اس شعر اکبر کے دوسرے مصرعہ سے اڑا دیا ہے

عنا پر جو کیسی شعر غزل کے ہیں وہ اس زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جو عاشق بھی ہو اور ساتھ ہی عارف بھی ہو۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا ۔۔۔ دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا
آنگئی تجھ کو نظر مانع عالم کی جھلک ۔۔۔ سامنے کچھ نہ رکھو آئینہ فطرت کے سوا
تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں پیدا دفتر ۔۔۔ ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

اور یہ شعر اتنی بار تو دہرایا جا چکا ہے کہ جیسے اردو ادب میں ضرب المثل بن گیا ہو (۳۱)

نہ کتابوں سے اور نہ کالج کے در سے پیدا   دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور اس کے مقابل یہ مطلع بھی خاص اکبری تیور اور اکبری ٹھاٹھ رکھتا ہے ؎

یہ بت پنہاں نہیں ہوتے خدا ظاہر نہیں ہوتا   غنیمت وہ زمانہ ہے کہ میں کافر نہیں ہوتا

لیکن اکبر آبادی کا کلام اگر ذہن میں ہو تو تعجب نہیں کہ ذیل کی غزل جو مزیدار یوں بھی ہے مزیدار اور طرفہ مزہ دے جائے ؎

پر سست ہے تو پھر کیا وہ تیز ہے تو پھر کیا   ہندو جو ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

رنج و خوشی کی سب میں تقسیم ہے مناسب   بابو ہے جو تو پھر کیا چنگیز ہے تو پھر کیا

کسی بھی سلطنت پر سب خوش نہ رہ سکیں گے   گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

دونوں ہی مر رہے ہیں دونوں کا حشر ہوگا   نیٹو جو ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

ذیل کی غزل (۵۵) "ماڈرن" ہے لیکن قدیم اور روایتی رنگ تغزل کو بھی سنبھالے ہوئے ہے ؎

ہے غضب جلوہ دیر خان کا   پوچھنا کیا ہے اس کے بانی کا

خوب جی بھر کے ہوئے بدنام   حق ادا کر دیا جوانی کا

کرتے ہیں مجھ سے بے تمیز کا شکریہ   شکر ہے ان کی مہربانی کا

قتل سے پہلے کلوروفارم   شکر ہے ان کی مہربانی کا

شیخ در گور و قوم در کالج   رنگ ہے دور آسمان کا

آتش اور ان کے شاگردوں کے زمانہ میں ایک چلی ہوئی زمین ردیف "نہ" میں آسمان ہو کر دابستان ہو کر داستان ہو کر تھی اور اس وقت کے استادوں کی کہی ہوئی بڑے معرکہ کی غزلیں اسی زمین میں تھیں۔ اکبر نے بھی شاید انھیں روایتوں سے متاثر ہو کر ایک غزل اسی زمین میں کہہ ڈالا (۷۹ تا ۸۳) جن

میں ہر غزل بجائے خود طویل ہے۔ ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتے چلیے ؎

مجھ ہی سے سب یہ کہتے ہیں کہ رکھ نیچی نظر اپنی — کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر
قریب ختم تھی مجلس کہ آ نکلے ادھر وہ بھی — غرض واعظ کی محنت رہ گئی سب رائگاں ہو کر
قیامت کیا ہے خلقت کو نہ صبر آنا جدائی پر — یہ فطرت خود بنے گی صور سر گرم فغاں ہو کر
کیا اچھا جنھوں نے دار پر منصور کو کھینچا — کہ خود منصور کو جینا تھا مشکل رازداں ہو کر
الگ رکھتی ہے فطرت ہوش کو ایسے موقع پر — کہیں افشا نہ کر دے راز مستی رازداں ہو کر
مری میت پہ فرماتے ہیں واعظ بدگماں ہو کر — قیامت میں ڈھلائے گا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس حصۂ غزلیات میں حالانکہ اس کے اندر غزلیں محض ردیف وار حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں تاریخ وار نہیں۔ شاعر جوں جوں آگے بڑھتا گیا ہے، حکمت، معرفت، سیاست، اور اصلاحی طنز کا رنگ اور نکھرتا گیا ہے اور ردیف "ن" اور ردیف "ی" میں کثرت سے ایسا کلام ملتا ہے جو اکبر کے ہر چھوٹے سے چھوٹے انتخاب میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ قدم قدم پر اس طرح کے شعر ملتے ہیں اور آخر حصۂ غزلیات تک ملتے چلے جاتے ہیں ؎

سانس بھی لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں — یہ نہ سمجھیں آہ کرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں — میں تو انگریزوں سے ڈرتا ہوں

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں — ڈور کو سمجھا رہا ہے سرا ملتا نہیں
اہل ظاہر جس قدر چاہیں کریں بحث و جدال — میں یہ سمجھا ہوں خودی میں خدا ملتا ہے (ص ۱۰۷، ۱۰۸)
بحث بھی فضول تھا یہ کھلا حال دیر میں — افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں (ص ۱۱۷)
دلیلیں فلسفہ کو نور باطن کر نہیں سکتا — کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں
ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں — تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہم سن کر نہیں سکتیں (ص ۱۲۶)
عوض قرآں کتاب سے ڈارون کا ذکر یاروں میں — جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں (ص ۲۲)

ہے پاس شریعت بھی ہم کو میں عشق کی لہریں بھی دل میں
پابند ہیں ساحل مذہب کے دریا کی طرح بہتے ہیں

اکبر کی برائی اچھائی تو پوچھو محلہ والوں سے
نظم ان کی سنی ہے البتہ شعر تو اچھے کہتے ہیں (۱۳۲)

شکر ہے راہ ترقی میں اگر بڑھتے ہو
یہ تو بتلاؤ کہ قرآن کبھی پڑھتے ہو

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو
مذہبی درس الف بے ہو علی گڑھ تو ہو (۱۴۶)

سب ہو چلے ہیں اس بت کافر ادا کے ساتھ
رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ (۱۴۸)

دیوانوں سے شعر نہ چھینے سب کا خلاصہ مجھ سے سنے
آپ کی صورت سبحان اللہ میری نعت توبہ توبہ

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ (۱۵۱)

بیکار رات کو یوں سر بستر پڑا نہ رکھ
اکبر جو مجھ کو نیند نہ آئے تو شعر کہہ (۱۵۳)

ردیف "ن" و "واؤ" و "ہ" کا جائزہ ہو چکا۔

(۳۳)

ردیف "ی" قدرتی طبعی بھی بہت ہے، اور شاید سب سے زیادہ پر بہار بھی لفظی صوری اعتبار سے بھی اور معنوی/ مغربی معیار سے بھی حسن بیان و لطف زبان پر کہیں کہیں کلام داغ کا دھوکا، اور معنویت کے لحاظ سے مثال کس کی پیش کی جائے اس کا معیار تو وہ خود ہی تھے۔ اب کلام ملاحظہ ہو ~

دل مرا ان پر جو آیا تو قضا بھی آ گئی
درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آ گئی

آئے کھوئے ہوئے یاد دن کہ تو شوخی سے کہا
میں بھی آیا ترے گھر میری بلا بھی آ گئی

وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی
بت کو دیکھا تو مجھے یاد خدا بھی آ گئی (۱۶۹)

دیوان میں جا بجا فارسی کا کلام بھی ہے۔ فارسی کو لوگ اس وقت تک بھولے نہیں تھے۔ کہنے والے بھی اور سمجھنے والے تو خیر بہت سے تھے لیکن ایک بات اس دیوان میں یہ بھی کھلتی ہے کہیں کہیں اکبر نظیر اکبرآبادی کی طرح اردو کے بجائے ٹھیٹھ ہندی بھاشا کا لفظ لے آتے ہیں۔ اور کلام کی شیرینی اس سے ذرا فرق نہیں آنے دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ~

سکھ پائے طبیعت جب تری رکھ شغل اپنا دن رات وہی
جو دل میں سمائے سمجھا ہے تیرے لئے حق بات وہی

وہ تو نے جو بدلا رنگ تو کیا تو اپنی نظر او پر کو اٹھا
دامن کے کرم میں کیا ہے کمی بدلی ہے وہی برسات وہی (ص ۱۶۹)

ایسا صرف کہیں کہیں ہے ورنہ عام رنگ تغزل کے ساتھ عام زبان وہی اردوے معلیٰ ہی ہے ؎

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
صداقت جل نہیں سکتی خوشامد ہو نہیں سکتی

مری ہستی خود شاہد وجود ذات باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو مختصر رد ہو نہیں سکتی

نہیں ہاتھ آتی دولت نام اٹھنے سے بزرگوں کے
بجائے جد کے ترکیب نسب سے ہو نہیں سکتی (ص ۱۷۰)

اس دور کا ایک شعر اب ہے جو شمار میں ہے ایک ہی لیکن اپنی جامعیت لطافت حسن و صداقت کے لحاظ سے پورے ایک دیوان پر بھاری ہے ؎

حسن ہے بے وفا بھی فانی بھی ـــــ کاش سمجھے اسے جوانی بھی ۔ غالب کی مشہور غزل ؎

آگے آتی ہے حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی ۔

ذہن میں تو ہوگی ۔ اکبر تبدیلی قافیہ کے ساتھ اس بحر میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

آئی ہوگی کسی کو ہجر میں موت
مجھ کو نیند بھی نہیں آتی

عاقبت بیں بشر سے یہ شوا[۱]
جانور کو ہنسی نہیں آتی

حال وہ پوچھتے ہیں میں چپ ہوں خوش
کیا کہوں شاعری نہیں آتی

مجاز کے ساتھ حقیقت اور حسن ادا کے ساتھ معرفت ان غزلوں کی جان ہے ؎

کر دیا نزع نے واقف کہ یہ ہستی کیا تھی
ہوش رہا تو کھلا حال کہ مستی کیا تھی (ص ۱۸۷)

ذیل کی غزل اس راقم الحروف کی زبان سے اور بھی دو ایک بار آچکی ہے لیکن یہ اتنی مرصع کہ طبیعت اس کے ذکر سے نہیں بھرتی ۔ اور آج کے جائزہ میں تو جی چاہتا ہے کہ بلا حذف انتخاب پوری کی پوری سنا دی جائے

الجھا رہے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی یہ مدد دل نے مرے طول امل سے

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

---

۱ کلیات میں پہلا مصرعہ غلط چھپا ہے یعنی عاقبت بیں کے بجائے عاقبت میں

ادراک نے آنکھیں شب اوہام میں کھوئیں — واقف نہ ہوا روشنئ صبح ازل سے
قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے — کس حسن سے یہ بھی سنو حسن عمل سے
حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تک چپ — عظمت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے
درجہ متحیر کا ہے بیخود ہے خرد تو — ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے
عبث کہن میں سمجھتا نہیں اکبر — جو ذرہ ہے موجود ہے ازل سے
یہ دعویٰ توحید مبارک تمہیں اکبر — ثابت بھی کرو اسکو مگر طرز عمل سے

"صاحبؒ کی لائی ہوئی تہذیب کے اندر مذہبی تعلیم بھی جس رنگ کی اور جس حد تک شامل ہے اسے غزل میں کی پیٹ میں حضرت اکبر اس زمانے میں فرماگئے ہیں ایسے پیرایہ میں جو مخصوص الخفیں کا حصہ تھا" ؎

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے — مگر یونہی کہ گویا آب زمزم میں مئے داخل ہے
کہاں تک داد دوں بیخبری بلاغت کی میں اے اکبر — یہ تیرا ایک مطلع لاکھ مضمونوں کا حاصل ہے

بعض غزلیں قریبہ تمام مسلسل کہی ہیں ان میں سے اشعار کا انتخاب کرنا ان کے تسلسل مسمون پر ظلم کرنا ہے لیکن بہرحال نقل امن بھی لموزہ ہو کہ تبصرہ کا حاصل محض "نقالی" میں رہ جائے ذیل کی ۱۳ شعر کی غزل کا بیشتر حصہ ملاحظہ ہو اور صرف اتنا یاد ہے کہ یہ کلام اس وقت کا ہے جب نئی تعلیم اور "نئی تہذیب" کا عین شباب تھا۔ داد ہی داد ہر طرف سے مل رہی تھی اور اس کی مضرتوں کا نام بھی کسی کی زبان پر مشکل سے تھا۔" ؎

یہ موجودہ طریقے راہئ ملک عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح حاجب روئے صنم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی — کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی　　لغات مغربی بلزار کی کھیا کا سے ضم ہو نگے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم گردوں میں　　زیادہ تھے جو اپنے غم میں وہ سب سے کم ہونگے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہو گا　　ہوئے جس ـــ سے پیدا اسی کے زیر دم ہونگے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر　　بہت نزدیک ہے وہ دن کہ نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

پیامِ یار لکھنؤ کی شاعری کا مرقع ایک پرانا اور اپنے زمانے کا مشہور شعری رسالہ یا گلدستہ تھا۔ غزلیں بغیر کسی اپیچ کے اس قدیم عاشقانہ رنگ کی شائع کرنے والا۔ اکبر بھلا کب چوکنے والے تھے۔ اس کی دی ہوئی طرح پر بھی غزل کہتے مگر دو ایک شعر تو ضرور ہی اپنے ہی رنگ کے نکال لیتے "کیجئے ظلم دم نہ ماریں گے" اس زمین میں فرماتے کیا ہیں؟

بحث میں مولوی نہ ہاریں ـــ گے　　جان ہاریں گے جی نہ ہاریں گے

اور قافیہ تو یہ نکالا ہے ؎

رزق مقسوم ہی سے ملے گا اپنے　　کیوں دنیا میں دوڑے ہاریں گے۔

(صـ ۲۵۴)

اور ظرافت اور دل لگی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کہنا نہ بھی چاہتے، جب بھی کہہ ضرور جاتے تھے۔ مومن خاں کی مشہور غزل یاد کر لیجئے"

؎ کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

قافیہ میں ایک خفیف تغیر کے ساتھ ؎

دیوانہ سمجھ ہمیں سمجھے وہ شرابی　　اب چاک کبھی جیب و گریباں نہ کریں گے

(صـ ۲۵۵)

اکبر کے بعض شعر جو اس کثرت سے زبان زد ہوئے، ضرب المثل کے پہنچنے کے قریب ہو گئے وہ اسی دور کے ہیں اور اکثر ردیف (ی) کے ہیں۔ مثلاً

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے　　وہ دیکھیں گھر خدا کا ہے خدا کی شان دیکھیں گے

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے ۔۔۔ ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے (صـ۲۴۸)

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے ۔۔۔ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

باقی عام معیار جو ردیف (ی) کے اس آخری حصہ میں کلام کی بلاغت، حسن، صناعی معنویت و لطافت کا ہے اس کے نمونہ کے لئے ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

نہیں غرور و حرص کو علم سے کیا مشرف ۔۔۔ تا چرخ بھی پہونچ کے وہ شیطان ہی رہے

(صـ۶)

ہے وہم نقش ہستی ہر چند دل نشیں ہے ۔۔۔ دیکھو اسے تو سب کچھ سوچو تو کچھ نہیں

(صـ۸)

کیا عرض آں و ایں کر کے ــــــــ چل دیئے وہ چناں چنیں کر کے

(صـ۱۰۱)

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے + وہ فلک رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے
وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی + وہ حسینوں میں رنگ وفا نہ رہا کہیں اور کیا وہ ہمیں نہ رہے
غم و رنج میں اکبر گر اہے گھرا تو سمجھ لے کہ رنج کو بھی ہے فنا کسی شئے کو جہاں میں نہیں ہے بقا تو اور زیادہ ملول نہ رہے

(صـ۲۶۹)

تو دل میں تو آتا نہیں ہے سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

صبر اس لئے اچھا ہے کہ آئندہ ہے امید ۔۔۔ موت اس لئے بہتر ہے آسان ہے یہی

(صـ۲۶۶)

بے نالہ و فریاد و فغاں رہ نہیں سکتے ۔۔۔ قہر اس پہ یہ ہے کہ اس کا سبب کہہ نہیں سکتے

(صـ۲۷۳)

ہم نے یہ نکتہ سنا ایک مرد حق آگاہ سے ۔۔۔ پھر گیا اس سے زمانہ جو پھرا اللہ سے

(صـ۲۷۴)

وہ عشق کیا جو نہ ہو نہ ہو ہادی طریق کمال　　جو عقل کو نہ بڑھائے وہ عاشقی کیا ہے

(صـ ۲۷۸)

مسلمانوں کو لطف عیش سے بسنے نہیں دیتے　　خدا دیتا ہے شیخ جی جینے نہیں دیتے

(صـ ۲۴۱)

شیخ جی اپنی سی بکتے رہے　　وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے
گائیں سبزہ پا گئیں کر کے کلیل　　اونٹ کانٹوں پر لپکتے ہی رہے

(صـ ۲۹۵)

سیکڑوں دور جنوں ہیں ابھی آنے والے　　مطمئن کیا نہیں مجھے ہوش میں لانے والے
خاتمہ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا　　مر گئے اٹھتے ہی اس بزم سے گانے والے
آپ اندھیرے میں ہی بجلی سے مدد لیتے ہیں　　چاند سورج رہیں راہ دکھانے والے
اب منکر غلامی ہی نہیں ملتی ہے　　سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے
رحم کر قوم کی حالت پہ تو اے ذکر خدا　　بے خدا ہو گئی مجلس ترے اٹھ جانے سے

اور کوئی کوئی شعر تو اس حصّہ میں مرتبہ خاص سے گذر کر درجہ اخص میں رکھنے کے قابل ہے ؎

یہ تمہارے ہی دم سے ہے بزم طرب ابھی جاؤ نہ تم نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ رہے

(صـ ۲۶)

• غزلوں پر سرسری تبصرہ ہو چکا اب ایک اچٹتی سی نظر رباعیات، قطعات و دیگر منظومات پر بھی ہو جائے ـــــ بہ کشکول نما عنوان مرتب صاحب نے یوں ہی دیا ہے ۔ رباعیات کوئی ۳۰ صفحہ میں آئی ہیں صفحہ ۲۳۵ سے صـ ۲۶۵ تک اور تعداد میں ۱۶۲ ہیں لیکن ایک آدھ چیز اس حصہ میں ایسی آ گئی ہے جیسے بجائے رباعی کے قطعہ

یا نظم کے ماتحت ہوتا تھا۔ مثلاً صفحہ ۲۵ کی وہ رباعی جس پر ۹۰ پڑا ہے ۔

لوگ ہنستے ہیں جو ہنسی آتی ہے یہ حالت بھی
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ
من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

اسی طرح ذیل کا قطعہ بھی جس پر رباعیوں کا نمبر ۱۵۰ پڑا ہے ۔

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیال ملت نہ ہوگا جب تک مفید ہرگز نہ بک ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی نانگ
غذا نہ ہوگی تو جیوں گا دیا کروتم ہزار نانگ

افسوس ہے کہ اس حصہ میں سنہ و تاریخ وغیرہ کہیں رہنمائی کے لئے موجود نہیں اسلئے کچھ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون سی رباعی کس زمانہ کی اور کس ماحول میں لکھی ہوئی ہے۔ سوا اس کے کہ یہ رباعی کے مضمون ہی سے کچھ سہارا مل جائے ۔

اکبر کی سیاسیات پہ آج کل خوب لے دے ہو رہی ہے اور زور و شور سے کہا یہ جارہا ہے کہ ملک کی سیاسی زندگی میں جدوجہد میں بلکہ تبلیغ وطنیت میں اکبر کا قطعاً کوئی حصہ نہیں۔ اعتراض اگرچہ غلط در غلط ہے اول تو کسی اچھے اور بڑے شاعر کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ اس نے وطن کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں حصّہ لیا ہی ہو اس لئے زبان ذکر اکبر اس بات ہی سے خاموش ہے تو اس سے شاعر کی منقصت ہی کیا ہوئی اور پھر کلام کی جانچ اور پرکھ معیار تو تمام تر اضافی اور حالات زمانہ کے تابع ہے۔ بلکہ ۱۹۵۰ء میں جو معیار تنقید ہے ۔ نہ یہ ہرگز ضروری ہے کہ آج سے قبل ۵۰ سال قبل بھی یہی معیار رہا ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ آج کے ۵۰ سال بعد بھی قائم رہ جائے اور ان دونوں زبانوں سے بڑھ کر یہ کہ اکبر کا جو پیام تھا، وہ تو اس "وطنیت" اور "اس کی آزادی" سے کہیں برتر اور وسیع تر تھا وہ آزادی تو "انگریز" اور انگریز حکومت سے نہیں بلکہ سرے سے "انگریزیت" سے چاہتے تھے "انگریز بیزاری" تو اکبر کی انگریزیت بیزاری کی صرف ایک شاخ اور اس سے کہیں تنگ و محدود تھی۔ اکبر کی نظر سیاسی

لیڈروں سے کہیں گہری تھی اور شاخ یوں ہی اصل تھی ۔

لیکن اب اس سے بھی قطع نظر خود یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ اکبر کے کلام میں وطنیت اور وطن دوستی کے اجزا ملتے ہی نہیں ۔ کلیات کا یہ حصّہ تو ان کے بہت سے قدیم کلام سے متعلق ہے ۔ عین ان کی سرکاری ملازمت کے زمانہ کا ۔ اس تک میں وطن دوستی کی تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد کی دعوت کی جھلکیاں موجود ہیں ۔ خاص اکبری انداز میں ؎

چُھلیاں ایک دوسرے کی وقت پہ جڑتے بھی ہیں
ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں

ہندو مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں
اس نظر اس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

(ص ۲۴۸)

چوتھا مصرعہ شاعرانہ تر شاعرانہ ہے ۔ ایک کی نظر جب دوسرے سے ملتی ہے تو اردو محاورے میں کہتے ہیں نہ کہ "نظر لڑ گئی" ۔ شاعر کی نظر محاورہ پر پڑ گئی ۔ اور دیکھئے اس سے پورا ایک مضمون کھڑا کر دیا — اب دوسری رباعی ملاحظہ ہو ۔ رنگ میں کچھ اس سے بھی شوخ تر ؎

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوا سے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

(ص ۲۵۱)

چوتھے مصرعہ کی روانی کیا خوب ! — موجوں کو لڑتے اور ساتھ ہی گلے ملتے کس نے نہیں دیکھا ہے ! کون جانتا تھا کہ اس کے گنگا جمنی سنگم کا شاعر یہ نکتہ پیدا کرے گا ۔

لیکن ۔ مثالیں بس کہیں کہیں اور خال خال ہی ہیں ورنہ اکبر کا اصل میدان

تو اخلاق کے حقائق اور ذہن کے معارف ہیں۔ دماغ دل، اور شکم کی تثلیث سے دیکھئے شاعر کا قلم توحید رقم کیا نکتہ پیدا کرتا ہے ؎

تھا میں کمال تو وہ سلطان بنا | تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندہ پر جب کا | تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

(ص ۲۴۷)

اکبر مذہبی بڑے گہرے تھے۔ لیکن مذہبی بحث کے زیادہ قائل نہ تھے۔ جانتے تھے اور دیکھتے تھے کہ مناظرہ بازیاں انسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہیں، اور فتنہ سامانیاں غیروں کی نہیں اپنوں کی لائی ہوئی ہیں۔ اب تلقین یہ سنئے ؎

مذہب کو لیا بحث میں سر پھوٹا | چاہی اصلاح تو خدا چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر | اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

یہی راگ ایک دوسری لے میں ؎

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے ڈھنگ | اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی امنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرات مذاق | ایماں برائے جنگ و مذہب برائے جنگ

یہ مذاق حضرت اکبر کے سمدھی صاحب کا تخلص تھا جو مذہب امامیہ رکھتے تھے۔
حال و قال کے نام سے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ سجادے اور خانقاہیں رفتہ رفتہ دوکانداروں میں کیسی تبدیل ہو گئی ہیں۔ دل روتا ہے تو زبان کھلتی ہے ؎

تحریک ضرورت معیشت ہے بہت | فرقہ کو بھی ہے اب خیال خلقت بہت
خالق کے جمال کا تو سودا کم ہے | اللہ کے نام کی تجارت ہے بہت

(ص ۲۴۹)

معنویت سے قطع نظر یہ تجارت کے ساتھ سودا کی لفظی مناسبت جو ہاتھ آگئی اسے گھاٹے میں سمجھئے۔

اکبر کا اصل مقام کلامیات کے مسائل اور الٰہیات کے حقائق ہیں ایک گہرے بڑے مسئلہ کو دیکھئے دو لفظوں میں ہاں کر کے بیان کر دیتے ہیں

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم — لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں رازِ دہر شکوہ ہے تو یہ — اور شکر ہے کہ موت آتی ہے

مخلوق کی زبان سے شکر و شکوہ کی یہ گنجائش، بلکہ ضرورت آج تک کسی اور ذہن رسا نے کیوں پیدا ہوئی ہو گی۔

"آسمانی باپ" اصطلاح مسیحوں کی صحیح لیکن آخر ہے تو اکبر مذہبی تخیل صریح الحاد و بے دینی کے مقابلہ میں وہ اس کی کتنی قیمت جانتے اور اس کی حمایت میں کیسا شاعرانہ نکتہ پیدا کرتے ہیں ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کی بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ

برق کے لئے کسی مفہوم میں بھی جب گرنے کا محاورہ چلا ہوا ہے تو اکبر اسی سے کیوں نہ فائدہ اٹھائے وہ یہ بار بار فرماتے تھے کہ قوم کا قوام تو مذہب ہی سے ہے جب یہی اصل کمزور ہو گئی تو ملت، امت قوم کی شیرازہ بندی کس چیز سے ہو گی۔ اس لئے اپنی دنیا سنبھالنے کے لئے بھی دین میں استحکام ضروری ہے

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم — دولت رخصت تو ذوقِ زینت معدوم
مسجد سے یہ آئی گوشِ اکبر میں صدا — مذہب جو مٹا تو زورِ ملت معدوم

(ص ۲۴۲)

بے پر ماتم جب غزلوں میں نہیں چھوڑا تو رباعیوں میں کیسے درگذر روا رکھتے کہتے ہیں اور ملت کے حال و مستقبل کو نظر میں رکھ کر کہتے ہیں

وہ شوکتِ شان زندگانی نہ رہی — غیرت کی حرم میں پاسبانی نہ رہی

پردہ اٹھا تو کھل گیا اے اکبر — اسلام میں اب وہ لن ترانی نہ رہی

لن ترانی کے جو لفظی معنی ہیں یا — ناقابل دید ہونے وہ، اور جو اردو روزمرّہ میں چلے ہوئے (شیخی اور تعلّی کے) وہ دونوں پیش نظر رہیں تب پڑھنے مصرعہ کا لطف آئے گا۔

اور بے پردگی کے سلسلہ میں یہ ان کی بہت پرانی رباعی خدا جانے اب تک کتنی دہرائی جا چکی ہے، لیکن اتنی جاندار ہے کہ پھر بھی ہر دفعہ زبان اور قلم پر لانے کے قابل ہے اور اسے لائے بغیر رباعیات اکبر کا مختصر سا انتخاب بھی ناتمام ہی رہے گا

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

(ص ۲۴۸)

الہ آباد کا ایک بڑا شاعر

(۱۴)

(یہ مقالہ دسمبر ۵۷ء میں یو پی ہندوستان اکاڈمی کی سالانہ کانفرنس منعقدہ
الہ آباد میں پڑھا گیا تھا اور ابھی تک غیر مطبوعہ تھا

نام سید اکبر حسین، تخلص اکبر۔ الہ آباد کا یہ فخر وطن، فخر ملک، فخر قوم شاعر "بڑا"
صرف نام کے لحاظ سے نہ تھا کلام کے اعتبار سے بڑا اور اپنی صف کے بہتوں سے بڑا تھا۔

سال پیدائش ۱۸۴۶ء۔ سال وفات ۱۹۲۱ء دنیا نے اس ۷۵ سال کے
عرصہ میں کیسے کیسے انقلابات دیکھ ڈالے! کیسی کیسی عظیم الشان ہستیاں درمیان میں
ہو گئیں۔ یہ سمجھئے کہ دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ خصوصاً ہندوستان کی دنیا سیاسی معاشی تمدنی
اخلاقی اعتبار سے۔ اکبر کی شاعری پر نظر اگر سرسری بھی کرنا ہے۔ جب بھی اس زمانہ اور اس
ماحول کو سامنے رکھنا لازمی ہے۔

اکبر کی ذاتی زندگی کچھ ایسے بڑے معرکے کی نہیں۔ ایک شریف گھرانے میں پیدا ہوئے
تعلیم وقت کے رواجی معیار سے اوسط درجہ کی پائی۔ گو بعد کو اپنی غیر معمولی ذہانت و
ذکاوت اور شوق علم و وسعت مطالعہ کی بنیاد پر اپنی استعداد علمی خوب بڑھائی۔ انگریزی
میں برق ہو گئے تھے اور عربی میں بھی۔ قرآن خوانی بہ غور بہ کثرت کرتے رہنے سے۔ کہنا چاہیے کہ عالم
ہو گئے تھے ملازمت کوئی چھوٹی سی شروع کی۔ پھر امتحان وکالت پاس کیا۔ منصف ہو گئے

اخلاقی و اصلاحی اور سیاسی شاعری اول اول یہ رنگ ہلکا رہا۔ سن کے ساتھ اسے ترقی ہوتی گئی۔
اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ ادھیڑ سن، ضعیفی کی شاعری کا بڑا حصہ اس با مقصد کلام کی
نذر ہے اور اس میں ان کا وہ ظریفانہ کلام بھی آ گیا جس میں معنویت کی گلکاریاں اور حقائق کی
چمن آرائیاں اور ظرافت برائے ظرافت نہیں بلکہ برائے زندگی ہے۔

اکبر بڑے ہی پر گو اور بڑے ہی زود گو تھے۔ شعر اس برجستگی اور بے ساختگی سے کہتے
جیسے ہم آپ باتیں کرتے ہیں۔ اور شعر کہنا آغاز جوانی یعنی ۱۷، ۱۸ سال ہی کی عمر سے شروع کر دیا
تھا۔ نتیجہ قدرۃً یہ ہوا کہ بہت کچھ کہہ ڈالا۔ سارا کلام چھپ جاتا تو آج پانچ دیوان ضرور موجود
ہوتے لیکن ایسا نہ ہوا۔ کچھ حصہ کو تو وہ قابل اشاعت ہی نہ سمجھے نہ کبھی اس کی جمع و حفاظت کا
انتظام کیا نہ کبھی کسی دوسرے کی زبان سے اپنے کلام کا یہ خارج شدہ سننا ہی پسند کیا۔
یہ کچھ تو ایسا کلام ہے جس میں شوخی کے ڈنڈے فحاشی کے قریب آ لگے ہیں اور غزل میں جھلک
ہزل کی ہو چلی ہے اور کچھ کلام ایسا ہے جس کے سیاسی پہلو کھلے ہوئے اور بے پردہ ہیں اور
پھر کچھ حصہ اغلب یہ ہے کہ بغیر کسی قصد و اہتمام کے یوں ہی بے خیالی میں نذر غفلت ہو گیا
بہر حال مطبوعہ مجموعہ کلام کلیات کے چار حصوں میں ہے ان میں سے پہلے تین اپنی زندگی میں
خود بھی چھپوا چکے تھے چوتھا حصہ وفات کے بعد مسودات سے لے کر شائع کیا گیا۔ اور اس
میں معقول حصہ میرا خیال ہے چھپنے سے رہ گیا ـ بعض متفرق نظمیں حضرت اکبر کی زندگی میں
الگ شائع ہو چکی تھیں وہ بھی اس میں نظر نہ آئیں مثلاً شریعت و طریقت کے باہمی تعلقات پر
وہ نظم جو نظم الہام کے نام سے خواجہ حسن نظامی دہلوی مدت ہوئی شائع کر چکے تھے۔
یا اور بہت سے متفرق اشعار جو کسی مخصوص تقریب پر شاعر کی زبان پر آ گئے تھے۔

اکبر کا کلیات اول پہلی بار سنہ ۱۹۰۹ء میں نکلا اور یہی ان کا ضخیم ترین کلیات ہے
اس کا چوتھا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ۲۶۱ کی ضخامت کا ہے اور اس میں چھوٹی
بڑی غزلوں کی تعداد ۳۰۰ ہے۔ کلیات دوم ۱۰۰ صفحہ کی ضخامت پہلی بار سنہ ۱۹۱۲ء میں شائع

اور پنشن کے وقت سشن ججی کے عہدہ پر تھے جو اس وقت معراج ترقی تھی۔ پنشن کے بعد زندگی کی مہلت کوئی ۲۰ سال کی اور پائی۔ شادیاں نام کو تین ہوئیں۔ لیکن پہلی بیوی عدم موافقت کی بنا پر برائے نام رہیں۔ دوسرا عقد ایک محبوبہ سے کیا۔ ان بیچاری کی زندگی بالکل ہی چند روزہ ثابت ہوئی۔ تیسری بیوی سے تعلقات بڑے ہی محبت کے رہے اور وہ عرصہ تک زندہ سلامت رہیں۔ آخر عمر میں ان کی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ انھیں کے بطن سے ایک نوعمر لڑکا ہر طرح مایہ تسکین تھا، وہ بیچارہ بھی ۱۴ سال کی عمر میں چٹ پٹ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ دونوں صدمے شاعر کو بڑے ہی سخت اٹھانے پڑے۔ فرماتے تھے کہ مذہب اور تصوف کا سہارا نہ مل گیا ہوتا تو دیوانگی کی نوبت پہنچ جانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رہی تھی۔ بڑے صاحبزادے "ولایت پلٹ" پہلے ڈپٹی کلکٹر اور پھر ڈپٹی کمشنر اچھے سرکاری عہدوں پر رہے۔ اکبر کی وفات کے بعد بہت عرصہ تک زندہ رہے — بس ذاتی زندگی کا خلاصہ کل اتنے لفظوں میں آ گیا۔

شاعری کے اعتبار سے اکبر کی زندگی کے دو رخ بالکل الگ ہیں اور کلام کے دو مختلف حصے ہیں۔ پہلا رخ عام عاشقانہ شاعری کا ہے اس میں اکبر غزل کے شاعر نظر آتے ہیں طرح کے مصرعوں پر غزل کہتے ہیں اسے مشاعروں میں سناتے ہیں اور وقت کی چلی ہوئی اور مقبول زمینوں میں لمبی لمبی غزلیں — دو غزلے سہ غزلے کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ تو ہوئی ان کی تفریحی اور بے مقصد شاعری۔ شروع زمانہ میں یہی رنگ غالب تھا اور کلیات حصہ اول غزلوں سے بھرا پڑا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ رنگ ہلکا ہوتا گیا۔ گویا بالکل ترک آخر وقت تک نہ ہو سکا اسے شاعری بغرض شاعری بھی کہتے ہیں اور ظریفانہ کلام کا جو حصہ معنویت سے قطع نظر، محض شوخی، مزاح اور لطافت ادبی کی غرض سے ہے۔ وہ سب بھی اس میں آ جاتے ہیں۔ گویا ظرافت بہ غرض ظرافت دوسرا رخ ان کے کلام کا وہ ہے جسے مقصدی شاعری کہنا چاہیے یا آج کل کی اصطلاح میں شاعری برائے زندگی۔ اس میں ان کا سارا عارفانہ کلام آ جاتا ہے۔ نیز ان کی

ہوا۔ اس میں غزلوں کی تعداد ۲۴۶ ہے تیسرا حصہ وفات سے صرف چند ہفتہ سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع
ہوا اور اس کی ضخامت ۱۵۰ صفحات کی ہے۔ غزلیں حصہ دوم میں اس سے طویل نہ تھیں بہ[illegible]
بہت مختصر تھیں اور بعض مختصر در مختصر ہو کر ایک آدھ شعر کی اور تھیں۔ اس تیسرے حصہ کی
غزلیات میں رنگ اختصار اور زیادہ نمایاں ہے اور کثرت سے ایسا ہے کہ ایک ہی شعر پر نمبر
مستقل غزل کا پڑ گیا اور اس حساب کو پیش نظر رکھ کر شمار ۱۷۱۹ تک پہنچتا ہے۔ چوتھا
حصہ حضرت کی وفات کے بعد بلکہ تقسیم کے بھی بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں کراچی سے شائع ہوا۔
اس کی ضخامت کل ۱۶۰ صفحہ کی ہے۔ یہ طبع و کتابت کی غلطیوں سے لبالب ہے اور اس میں
اس میں غزلوں کی تعداد کل ۱۳۱ ہے رباعیات و قطعات کی بھی دو جلدیں شرح و حاشیہ
کے ساتھ اسی کے بعد کراچی سے شائع ہوئیں لیکن یہ سب انھیں چاروں کلیات سے ماخوذ
و منقول ہیں اور کراچی میں بزم اکبر نے جو اب خود ہی مرحوم ہو چکی ہے۔ کلیات کے تینوں
حصے بھی دو جلدوں میں کر کے از سر نو شائع کر دیئے تھے۔ ان چاروں کے باہر کلام جو
کچھ ہے وہ متفرق طور پر مختلف رسالوں میں پایا جاتا ہے۔ یکجا و مرتب کہیں نہیں ملتا

آج کی مختصر لیکن منتخب صحبت میں جو اتفاق سے حضرت اکبر کے وطن و مدفن
ہی میں منعقد ہو رہی ہے کلیات کے انہیں چار حصوں کا ایک سرسری جائزہ ایک ادنیٰ
طالب علم، اہل علم و ارباب فن کی خدمت میں استفادہ پیش کر رہا ہے۔ جہاں جو
بات قابل اصلاح نظر آئے بے تکلف اس سے آگاہ کر دیا جائے۔ پہلے نظر حضرت اکبر
کے عاشقانہ کلام، یعنی حصہ غزلیات پر کی جائے گی اور اس کے بعد ذکر ان کے مقصدی
کلام کا آئے گا۔

عرض کر آیا ہوں کہ اکبر نے شعر گوئی کم عمری ہی سے شروع کر دی تھی۔ ۱۷، ۱۸،
سال کے لڑکے کی بساط ہی کیا لیکن اس سن کی بھی یہ طراریاں اور کلیلیں ملاحظہ ہوں

جانِ زنجیرِ گیسو پھر کھنچا جاتا ہے دل　　دیکھئے اب میرے سر پر کیا بلا لاتا ہے دل

خوف کے پردے میں چھپ جاتی ہے جانِ ناتواں — عاشقی کے معرکے میں کام آجاتا ہے دل
ساتھ ساتھ اپنے جنازے کے یہ چلاتی تھی روح — ان کو مٹی میں ملانے کو لئے جاتا ہے دل

دوسری غزل اسی سن وسال کی ہے

اجل سے وہ ڈریں جینے کو جو اچھا سمجھتے ہیں — یہاں ہم چار دن کی زندگی کو کیا سمجھتے ہیں
اسے ہم آخرت کہتے ہیں جو مشغول حق رکھے — خدا سے جو کرے غافل اسے دنیا سمجھتے ہیں
گواہی دیں گے روز حشر یہ سارے گناہوں کی — سمجھتا میں نہیں لیکن میرے اعضا سمجھتے ہیں

ذرا لڑکپن کے سن دیکھئے اور عبرت ومعرفت کی یہ باتیں دیکھئے اب سن ۱۹ اور ۲۰ سال کی ہوچکی ہے اس وقت کا رنگ ہے

سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی — یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

پیش مصرعہ حضرت اکبر کا ہے دوسرا مصرعہ امتحان کے لئے دیا گیا تھا۔

خدا کی شان وہ میرا اثر پنا دل لگی سمجھیں
کسی کی جان جاتی ہے کسی کا دل بہلتا ہے

محبت ان سے کر کے پھنس گئے ہیں ہم تو آفت میں
نہ دل قابو میں آتا ہے نہ ان پر زور چلتا ہے

اس کم سنی میں خیالات کی پختگی ملاحظہ ہو۔

بے خودی پردۂ کثرت جو اٹھا دیتی ہے — ہر طرف جلوۂ توحید دکھا دیتی ہے
پوچھتا ہوں حیرت سے ہستی — راستہ گور غریباں کا بتا دیتی ہے

اکبر کو کچھ لوگوں نے محض دل لگی کا شاعر قرار دیا ہے بڑے دل لگی باز شاعر ایسے ہوتے ہیں" اور وہ بھی اس کم سنی میں! کہیں کہیں شعر یقیناً عاشقانہ طرز کے اور خالص نوجوانی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے بھی نکلتے ہیں۔

یا شباب جوش یہ ہے دلولے میں جو بن کے
کبھی وہ جھوم کے چلتے ہیں اور کبھی تن کے

جب ان کو رحم کچھ آیا حیا نے سمجھایا
بگڑ بگڑ گئی تصویر مہندی کے بن کے

ان دنوں یار کے کچھ لہجہ میں دل تہ نشیں اور بھی ہے
جانتا ہے کہ نشست ان کی کہیں اور بھی ہے

کہیو اس غیرت لیلیٰ سے یہ پیغام صبا
پہلوئے قیس میں ایک دشت نشیں اور بھی ہے

یا جذبۂ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہے
گھنگرو کی جانب ذرا کچھ صدا آئی تو ہے

عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے
پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

لیکن عام رنگ تغزل اس زمانہ میں وہ نہیں بلکہ یہ ہے ؎

اے خوف مرگ دل میں جو انساں کے تو رہے
پھر کچھ ہوس رہے نہ کوئی آرزو رہے

ہنگام نزع روح نے قالب سے یہ کہا
اس خاکدان تیرہ میں بے آبرو رہے

اب تک ترے سبب سے رہے ہم بلا نصیب
اب تا بہ حشر گور کے پہلو میں تو رہے

پڑھی غزل جو مشاعرہ میں پڑھی اس وقت عمر کا انیسواں سال تھا۔ وہ اسم شعروں کی اور تین تین مطلعوں والی ہے۔ ابھی مطلعے ملاحظہ ہوں۔

مجھے وہ بھی اس کو جو ہو دیوانہ کسی کا | اکبر یہ غزل میری ہے افسانہ کسی کا
ملتے ہیں یا بت جلوہ مستانہ کسی کا | یا کعبہ مقصود ہے بت خانہ کسی کا

گر شیخ و برہمن سنے افسانہ کسی کا　　معبد نہ رہے کعبہ و بت خانہ کسی کا

آج کی گھاتیوں مزوریات زندگی کی کمیابیوں اور ناکامیوں اور رشوت کی قدم قدم پر گرم بازاریوں ہر ذہنی کلفتوں اور پریشانیوں سب کا نقشہ کسی اعجاز کسی اعجاز کے ساتھ اس مختصر سے عکس میں آج سے ۵۰ سال قبل ہی کھنچ آیا. جمہوریت اور حکومت خود　　نقارہ پر چوب اسی وقت سے پڑنے لگی تھی. اکبر ان خوشنما خوش رنگ کھلونوں سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوئے بلکہ الٹے یہ فرمایا

قوم کے دل میں کھوٹ پیدا　　اچھے اچھے ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ　　سمجھیں اس کو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی　　سلف گورنمنٹ آگے آئی
یا　دن کا ہوش اب فکر نہ سر کی　　ووٹ کی دھن میں بن گئے پھر کی

ملک کے اندر خانہ جنگی اور وطن مشترکہ کی تقسیم تو اب ہوئی ہے. اکبر اپنے ہی زمانہ میں فرما گئے تھے. ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے　　خدا کی مار سے دونوں کی مار کیا کم ہے

شیخ و برہمن کے درمیان اخلاص کے فقدان اور خود غرضی اور خود مطلبی کے کے تسلط کا بھانڈا چورا ہا پر آکر بہت بعد کو پھوٹا. اکبر کے جام جم میں اس کا ہلکا سا نقش اسی زمانہ میں آج سے نصف صدی پیشتر نظر آگیا تھا. فرماتے ہیں ؎

واسطے اللہ کے ہو اب دوستی اب وہ کہاں
ہاں تجارت اور پالٹیکس میں دیکھیں جو سود
چندراہ متفق ہوں ورنہ شیخ و ہنود
واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

" صاحب کی چند نئی اصطلاحیں ہم کو سکھا دیں اور ہم　　کا اصل

حقائق کو بھول بھال کر ساری امیدیں انھیں کے دم قدم سے قائم کرلیں اور ان چلی ہوئی اصطلاحوں میں نمبر اول پر "لفظ ترقی" ہے۔ بدتر سے بدتر بھی جو عیب چاہے اس ترقی کے دور میں ہنر کے دکھا دیجئے۔ اکبر کی زبان حقیقت ترجمان میں کہتی ہے کہ ؎

شیطان نے ترکیب تنزل پہ نکالی ہے ۔۔۔ ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

اور کبھی یوں کہ ؎

شیر ان مشرق کا انھیں منظور ہے شکار ۔۔۔ بیٹھے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق میں

پالٹکس اس وقت ہر چیز پر غالب ہے۔ علم و فن پر بھی اس حقیقت کو یوں سنئے ؎

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض ۔۔۔ سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا

بہر خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع ۔۔۔ صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

اکبر الہ آبادی

(متوفی ۱۹۲۱ء)

(۱۳)

اکبر کا کلام اس کم سنی میں سنا کہ اب وہ زمانہ بھی یاد نہ رہا کوئی ۸، ۹ سال کا سن ہو گا ان کے دل لگی کے شعر ایک ایک زبان پر تھے۔ خیال یہی تھا کہ شاعر صاحب بڑے ہنسنے ہنسانے والے ہوں گے اور ہر وقت ہنستے رہتے ہوں گے۔ ۲۰ سال کے سن میں ۱۹۱۴ء میں جب ملاقات ہوئی تو یہ خیال بے بنیاد پایا۔ ہنسانے تو بے شک تھے لیکن خود بہت کم ہنستے اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنستے تو شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ آخر میں ہنسی میں اتنی کمی شاید استحضارِ آخرت کا نتیجہ ہو۔ قائل توحید کے بھی سخت قسم کے ہو گئے تھے

۱۹۱۰ء میں ان کے صاحبزادے سید عشرت حسین بی۔ اے کیمبرج، ڈپٹی کلکٹر ہو کر سیتاپور آئے اور ہمارے گھر اترے۔ یہ کوٹھی راجہ صاحب محمود آباد کی تھی اور دو ایک کمرے خاص راجہ صاحب کے لئے خالی رہتے تھے۔ انھیں خالی کمروں سے کام لیا۔ میں اس وقت لکھنؤ میں کالج میں پڑھ رہا تھا اور کلیات اکبر حصہ اول پڑھ چکا تھا۔ میرے والد صاحب خود پنشنر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان نئے ڈپٹی کلکٹر کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اکبر زادہ کی حیثیت سے ان کی اور زیادہ خاطر مدارات کی۔ عشرت صاحب معاشرتی کے اعتبار سے بالکل صاحب بہادر تھے۔ یہاں تک کہ اردو بھی ذرا اٹک اٹک کر بولتے تھے اور یہ معلوم ہوتا کہ جیسے انگریزی سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ والد صاحب نے ان کی

اسلامی معاشرت کی طرف بھی دھیان رکھا چنانچہ جب عید کا دن آیا تو ان کا سوٹ اتروا کر اور شیروانی پہنا کر اپنے ساتھ عید گاہ لے گئے۔ اکبر صاحب ان باتوں سے بہت ہی خوش ہوئے۔ انھیں تو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی تھی۔ اسلامی تربیت و معاشرت کو اپنے برخوردار کے حق میں ترسے ہوئے تھے۔ یہ عین وہ زمانہ تھا کہ جب میرے الحاد و تشکیک کا شباب تھا۔ یہ جب سیتا پور آتا تھا تو ان ڈپٹی صاحب سے خوب مزے مزے کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ڈپٹی صاحب تازہ ولایت، دہریت و لاادریت کے رنگ ڈھنگ سے خوب واقف تھے۔ خیالات میں اپنے والد گرامی کی حرارت ایمانی سے کوئی نسبت نہ رکھتے۔ لیکن تھے تو انھیں کی اولاد الخ

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں

کبھی کبھی میری فرنگیہانہ لن ترانیوں پر خوب چوٹ کر جاتے اور میرا منہ بند کر کے رہتے۔ اس امریکہ کے مشہور عالم نفسیات کا ڈیم جیمس کا بہت زیادہ قائل تھا اس کی وفات کی خبر آئی۔ میں نے حسرت صاحب سے کہا (گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی) کہ وقت کا سب سے بڑا شخص (THE CREATEST MAN) اٹھ گیا۔ اس پر وہ ہنسے اور بولے کہ" وقت کا سب سے بڑا شخص اگر یہ تھا تو مل (MILL) کے لئے آپ کیا کہیں گے؟ (اس ملحد فاسق کے بھی شیدائیوں میں تھا) میں نے ترنت کر جواب تھا دیا کہ" وہ تو اپنے وقت کا نہیں ساری دنیا اور کل زمانوں کا سب سے بڑا شخص (The great man of all times) تھا۔ اس پر وہ خوب ہی ہنسے اور بولے کہ" اچھا اپنا یہی فقرہ آپ کاغذ پر مل کے متعلق لکھ کر آج کی تاریخ ڈال دیجئے۔ میں دس سال بعد آپ کو دکھلا کر پوچھوں گا کہ کہئے اب وہ جوشِ عقیدت کہاں گیا۔

دس وقت تو میں نے جوش جاہلیت جاری رکھا اور شاید یہی کہا کہ دس برس

نہیں بیس برس تو یہی قول اٹل رہے گا! حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ عشرت صاحب دس برس نہیں پانچ برس بعد میرا مواخذہ و محاسبہ کرتے تو یہی تبعیض جا نکتا رہ جاتا۔

لیجئے یہ اکبر صاحب کے ذکر میں ان کے فرزند دلبند کا اتنا تذکرہ کہاں سے نکل پڑا مارچ یا اپریل ۱۹۱۴ء تھا۔ جب میں امتحان دینے الہ آباد گیا لکھنؤ یونیورسٹی اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی۔ لکھنؤ کے طلبہ کو بی۔ اے کا امتحان دینے الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ گیا اور وقت نکال کر حضرت اکبر کی خدمت میں ایک سے زائد بار حاضری دی۔ سراپا کرم و شفقت نکلے۔ بڑے ہی خلق و لطف سے ملے۔ میں سن میں ان کے صاحبزادے سے بھی ۸، ۱۰ سال چھوٹا تھا لیکن وہ پیش اس طرح آتے کہ جیسے ان کے برابر کا ہوں۔ اپنا کلام سنایا۔ میرے مذہبی خیالات سے بھی کچھ واقف ہو چکے تھے کچھ بند بند اشارے ادھر بھی کئے۔ الہ آباد سے لوٹ کر لکھنؤ آیا تو راستہ کھل گیا تھا۔ مراسلت شروع کی اور اچھی خاصی مستعدی سے اور پابندی سے جاری رکھی۔ جواب جلد جلد آتے مفصل بھی ہوتے اکبر کا جو پایہ شعر میں ہے ظاہر ہی ہے نثر بھی بڑھی اچھی لکھتے تھے۔ سادہ سلیس اور شگفتہ اور صحیح تو خیر ہوتی تھی مجھے تو نثر میں ریاض کے ہم رنگ و ہم سطح نظر آتے۔

والد مرحوم کا انتقال نومبر ۱۹۱۲ء میں مکہ معظمہ میں وسط ذی الحجہ میں ہوا عین ارکان حج سے فراغت کے بعد حضرت اکبر نے میری گذارش پر قطعہ تاریخ لکھا کمال یہ کیا کہ صرف ایک لفظ شغل (بہ اصطلاح صوفیہ) سے پوری تاریخ نکال دی ہے ؎

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے　　　شغل ہی سے نکلی تاریخ وفات

۱۳۳۰

خوا ٹیرے دلچسپ ہوتے تھے، ادبی بحثیں تو قدرتاً ہوتی تھیں، دینی، اخلاقی و

وسیاسی نصیحتیں بھی کرجاتے تھے۔ اور زبانی ملاقاتوں میں تو اصلاحی عنصر ہر چیز پر غالب رہتا۔

بحث ومناظرہ کی طرف کبھی آتے۔ زر شیریں، بلیغ، بہرکیف ہمیشہ کام کی بات کہہ جاتے۔ یہ خوب خیال رہے کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں اور اس کے کئی سال بعد تک کا زمانہ بڑے الحاد و بے دینی کا رہا۔ جراثیم اس کے سنہ ۱۹۰۹ء ہی سے پیدا ہو چکے تھے مغربی فلسفیوں اور مادہ پرست فرنگیوں نے اپنی تاریخی بلکہ طبی کتابوں تک سے اسلام کو داغ داغ کرکے رکھا تھا اور میں مغرب کا پرستار اس وقت بے تحاشہ ان کا شکار بن گیا تھا اور فرنگی تحقیقات کا ذکر زہر اپنے انڈیلتا رہا۔ قدرۃ ذات رسالتؐ سے (نعوذ باللہ) ایک بغض وعناد سا ہو گیا وحی و نبوت ایک وہم آرائی ہی نظر آنے لگی۔ ایک رکیک کتاب بھی اس زمانے میں اپنے ہی بدبخت قلم سے ایسی نکلی جس میں اصلی تحقیق کا ہدف انبیاء کرام علیہم السلام کو بنایا تھا۔ کتاب اکبر صاحب کی خدمت میں بھی ہدیۃً بھیجی۔ کتاب کے آخر میں مضمون اس قسم کا تھا کہ اپنی دھاک اور اپنا رعب   میں قائم رکھنے کی یہ تدبیریں اختیار کی جائیں، یا کچھ اور، بہرحال قضا وموت سے کسی کو بھی چارہ نہیں۔ کسی نہ کسی دن بڑے سے بڑے لیڈر کا بھی اقبال غروب ہو کر رہتا ہے۔ اکبر صاحب نے فرمایا جب کچھ ہی روز بعد الہ آباد میں جا کر ملا کتاب آپ نے مجھے بھی بھیجی۔ فلسفہ پڑھنے کے لئے دماغ کہاں سے لاؤں ہاں اخیر کے اس مضمون پر نظر پڑ گئی جہاں آپ نے بالآخر ہر حکمت کو تدبیر کے لئے فنا لکھی ہے۔ بس دل اس سے باغ باغ ہو گیا یہ تو کچھ ایسا ہوا کہ ایک بیوا محفل میں گا بجا رہی ہو۔ سارا مجمع اس کی اداؤں پہ فدا ہو رہا ہو یکبارگی وہ گرے اور اپنی جان دے دے وہی محفل جو اب تک لذت پرستی اور واہ واہ میں مست تھی۔ یک بہ یک بزم عزا و ماتم میں تبدیل ہو جائے

گی۔ میرے اوپر تو کتاب کا کچھ ایسا ہی اثر پڑا کبھی کبھی لکھنؤ تشریف لاتے، ایک
مرتبہ تو میرے ہی یہاں قیام فرمایا۔ گھر خالی تھا۔ زمانہ اس وقت نہ تھا۔ کئی برس تک
لکھنؤ کے شاعروں کا خوب جمگھٹا رہا۔ خوب خوب حضرات ملنے آتے رہے۔ اور یہ تو
ایک بار ہوا باقی کبھی امین آباد میں اپنے کسی الٰہ آبادی تاجر دوست کے ہاں ٹھہرے
کبھی قیصر باغ میں سلیم پور ہاؤس میں افتخار حسین کاکوروی کے ہاں اور کبھی خود مجھے
الٰہ آباد بلا بھیجتے۔ اور کرایہ منی آرڈر سے پیشگی بھیج دیتے۔ ایک بار پرتاپ گڈھ بلا بھیجا
کہ ڈپٹی عشرت حسین اس وقت وہیں تھے جب اس طرح مہمان بنتا خوب خوب باتیں
کرتے، اب کیا بتاؤں کہ کتنا مستفید ہوا، ادبی بحثوں اور ان سے بڑھ کر دینی و
روحانی حکیمانہ کلمات سے ایک بار فرمایا کہ "آپ نے کالج میں زبان کون سی لی تھی"۔
عرض کیا کہ "عربی"۔ بہت خوش یہ سن کر ہوئے اور بولے "اب بھی عربی کا مطالعہ جاری
ہے؟ عربی تو دنیا کی زبردست زبانوں میں ہے، یورپ والے بھی اس کا لوہا مانتے
ہوئے ہیں۔ میں نے مرے ہوئے لہجہ میں عرض کیا کہ "اب کہاں موقع ملتا ہے۔ انگریزی
سے ہی چھٹی نہیں ملتی"۔ بولے کہ "آسان ترین صورت یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کا معمول
رکھئے۔ اس کی زبان کی فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا۔ جرمنی یونیورسٹی میں عربی کے نصاب
میں آخر کا آدھا قرآن شامل ہے، اور ہاں آپ کے لئے نہ وضو کی قید ہے نہ کسی وقت و
مقدار کی، بس جتنا جی چاہے پڑھ لیا کیجئے، بس اس سے عربی زبان سے رابطہ آپ کا
بالکل قائم رہے گا۔ جو فقرے آپ کو پسند نہ آئیں، ان سے سرسری گذرتے جائیے۔
سمجھئے کہ وہ آپ کے لیے ہیں ہی نہیں۔ ہاں کبھی کوئی فقرہ پسند آجائے گا۔ بس اس کو
توجہ سے دو تین مرتبہ پڑھ لیا کیجئے"۔ کس حکمت کے ساتھ آپ نے دیکھا کہ ایک ملحد کو
قرآن کی طرف لائے۔

ایک مرتبہ بولے کہ کیوں صاحب آپ کو اللہ میاں سے متعلق جو کچھ شک وشبہ

رہے ہیں، یہ فرمایئے کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟" سوال سنتے ہی میں چکرا گیا۔ اور دب دبا کر بولا کہ "جی نہیں اس میں کبھی شبہ ہوا ہی نہیں اور شاید ہو سکتا بھی نہیں ہے" بولے کہ "بس اتنا ہی کافی ہے۔ اپنی عبدیت کا اقرار کئے جایئے۔ رہی اللہ کی ذات و صفات تو وہ آج تک کسی کی سمجھ میں آئی ہیں؟ جنھیں بڑے سے بڑا عالم و عارف کہا جاتا ہے۔ وہ بیچارے انھیں بحثوں میں حیران و ششدر نظر آتے ہیں جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

"بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو"

میں قائل تو مؔا کیا ہوتا البتہ سوچ میں اسی وقت سے پڑ گیا اور دماغ کو ایک نیا موضوع سوچنے کو مل گیا۔

ایک بار جب از سر نو مسلمان ہو چکا تھا اور اکبر صاحب کا مہمان بن کر انھیں کے دولت خانے میں ان کے ساتھ نماز ظہر میں پہلی بار شریک ہوا تو بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور بولے کہ "آپ کے والد مرحوم کو فرشتوں سے آپ کی نماز کی خبر سن کر کس درجہ مسرت ہوئی ہو گی۔

ایک بار کچھ عرصہ بعد اس زمانے میں جب میرے اوپر مثنوی رومی کا اثر غیر معمولی تھا اور گویا قرآن مجید سے بھی بڑھ کر مثنوی کو سمجھ رہا تھا اور بار بار گفتگو میں حوالہ حضرت رومی کا دیا تھا اکتا کر حضرت اکبر بولے "کہ" اچھا صاحب، یہ بتایئے کہ اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا رومی صاحب؟ ظاہر ہے کہ لاجواب ہو جانے کے سوا اس کا جواب ہی کیا دے سکتا تھا۔ اس پر بولے کہ "آپ کی زبان سے بجائے اللہ کے ذکر کے نام مولوی رومی کا سنتا رہتا ہوں۔ میں سمجھا کہ شاید وہ اللہ میاں سے بھی بڑے ہیں۔ آپ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ مولانا نے آپ کو ہدایت دی اور اللہ تک وہ آپ کو وہ لے آئے۔ سوچ کا یہ طریقہ بدلئے۔ یہ سمجھئے کہ اللہ نے مولانا کا ذریعہ آپ کی ہدایت کا ذریعہ بنالیا

ایک مرتبہ فرمایا کہ "لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ وقت چلا گیا۔ زمانہ گیا، تو یہ وقت اور زمانہ آخر کہاں چلا جاتا ہے" پھر ایک لمحہ بھر کر خود ہی فرمایا کہ "آسان جواب بتائے دیتا ہوں اللہ میاں کے پاس سے آیا تھا اور انھیں کے پاس چلا جاتا ہے اور وہاں جاکر کون چیز ضائع نہیں ہوتی۔ ہر چیز محفوظ اور جمع رہتی ہے۔ پھر جب وقت وہاں جمع ہے تو جو کچھ بھی اس وقت کے اندر ہوا ہے وہ بھی لامحالہ جمع ہوگا۔ اب اللہ جب اس وقت کو زندہ اور حاضر ہونے کا حکم دے گا تو جو کچھ بھی اس وقت کے اندر ہوا ہے، سب ہی کچھ اس کے ساتھ حاضر ہو جائے گا۔ اپنا ہر عمل رجسٹر پر لکھا ہوا نہیں بلکہ بجنسہٖ اپنی اصلی حالت و نیت کے ساتھ ہوتا ہوا مل جائے گا۔"

اس طرح واللہ اعلم کتنے مسائل تصوف و فلسفہ کے انھیں لطیفوں اور چٹکلوں کی صورت میں بیان کر جاتے تھے اور کوئی صحبت اس سے خالی نہ ہوتی۔ عجب جامع کمالات ذات تھی!

توحید کا اتنا غلبہ میری نظر نے تو بہت ہی کم کسی پر دیکھا ہے، کوئی بات کہیں سے بھی شروع ہوتی، جھٹ وہ اس کا سرا لاکر اللہ میاں سے ملا دیتے۔ بزرگوں اور اولیاء اللہ کا ذکر زیادہ دیر تک نہیں سن سکتے تھے۔ فوراً توحید پر لے آتے۔ حد یہ ہے کہ نعتیہ مضمون یا شاعری کو بھی دیر تک چلنے نہ دیتے بلکہ کوئی نہ کوئی فقرہ اس طرح کا ضرور بول دیتے کہ "جی ہاں ہمارے اللہ میاں کا کیا کہنا، دیکھیے کس قیامت کا جامع بشر پیدا کیا۔"

ایک دن بولے کہ "جن شاعری نے محض شاعری اور ادبیت زبان کی بنا پر کمال حاصل کرنا چاہا انھیں قبول عام حاصل نہ ہوا اور فن کی شہرت بھی ادبی، علمی حلقوں تک محدود رہی۔ مثلاً شاہنامہ اور سکندر نامہ لکھنے والے لیکن جنھوں نے اپنے کو مٹا کر اللہ کا نام بلند کیا۔ اللہ نے ان کی یاد کو بھی محفوظ کر دیا اور ان کا نام گھر گھر

پہونچادیا۔ جیسے مولانا ، روم سعدی یا امیر خسرو وغیرہ"۔

مغربی تہذیب و تمدن کے لائے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے مگر یہ ان کے یا کسی اور کے بس میں کہاں تھا اور مشرقی تہذیب اور اسلامی ثقافت کی تبلیغ بڑے دلچسپ مؤثر و دل نشین انداز میں کرتے رہتے۔ علمائے عصر میں حضرت تھانویؒ کے دل سے قائل تھے اور اک حد تک دوسرے دیوبندی حضرات کے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے علمی کمالات کے قائل تھے۔ مگر اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ فرماگئے ہیں ؎

ہے دل عارف مثال دیوبند ـــــ اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

خود گاندھی جی کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے۔ میں خود البتہ اس زمانے میں بڑا "گاندھوی" تھا اور ان کی روحانیت کا چرچا ہر جگہ کرتا رہتا تھا۔ اکبر صاحب کے سامنے بھی کیا۔ اکبر صاحب نے کچھ دیر بعد سوال کر دیا "ہاں صاحب آپ کے مہاتما گاندھی کی کمیٹی ترک موالات میں شرکت کی پہلی شرط ہوگی۔ توحید کے قائل ہوئے اور لاالہ الا اللہ کے پڑھنے کی ہوگی۔ اور جواب مجھ سے نفی میں ہاں ہولے کہ "میں آپ کی روحانی داد و تحسین سے یہی سمجھا تھا کہ پہلی شرط توحید کی ہوگی۔ انتہا یہ کہ اقبال کے بھی سو فیصدی مداح نہ تھے ، جا بجا لطیف چوٹیں کر جاتے مثلاً ؎

کالج میں ہو چکا ہے جب امتحاں ہمارا
سیکھا زباں نے کہنا ہندوستاں ہمارا
رتبہ میں کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے
ہندوستان کیسا سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم۔
جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

فرمایا کرتے ، جنگ میں فتح تکوینی مصلحتوں سے ہوتی رہتی ہے، مسلمان کا کام

کام تو ہر قدم پر شریعت کا دامن پکڑے رہنا ہے، انجام جو کچھ بھی ہو، اصل مصیبت اس وقت یہ ہے کہ ہم نے خیال آخرت کو بالکل بھلا دیا، اور دامن صبر و رضا یکسر چھوڑ دیا۔ خود "تحریک" آزاد رہا، کیا ہے بس اپنی انانیت کا اشتہار! کہہ گئے ہیں

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم

دلوں کو طاعت حق سے دور رکھتے ہو

نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں خلل انداز

ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

وقت آخر آیا تو خواجہ حسن نظامی پاس بیٹھے ہوئے تھے، ان کا بیان ہے کہ نبض پر میرا ہاتھ تھا جب میں کلمہ لاموجود الا اللہ کہتا تو ڈوبتی ہوئی نبض ایک بار پھر تیز ہو جاتی تھی۔

ستمبر ۱۹۲۱ء میں یہ پیر ظریف دنیا کو یاد آخرت اور توحید اور ترک معاصی کا سبق دیتا ہوا رخصت ہوا۔

اکبر گرچہ آپ کا ہرا نہ لے گیا　　لیکن خدا کی دیں کی گواہی تو دے گیا

بہ طور مکرر عرض ہے کہ سخن فہمی اس نااہل کو آئی ہی کب لیکن ٹوٹی پھوٹی نام جو کچھ بھی آئی یہ طفیل صرف دو بزرگوں کا ہے۔ ایک مولانا شبلیؒ اور دوسرے اکبر کا شعر کے ظاہری معنی و مطالب ساخت و ترکیب نشست الفاظ کی لفظی و ادبی خوبیوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ یہ مولانا شبلی کا فیض ہے۔ اکبر شعر کو کبھی ترنم کے ساتھ نہ پڑھتے ہمیشہ سادہ، تحت اللفظ طریقے سے پڑھتے تھے مگر اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پورا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا اور شعر کی معنویت آئینہ ہو کر رہتی۔

— · —

مختصر حالاتِ زندگی

نام	سید اکبر حسین رضوی
تخلص	اکبر
سالِ پیدائش	۱۸۴۶ (۱۶ / نومبر)
مقامِ پیدائش	بارہ ضلع الہ آباد۔ معزز سید گھرانے کے فرد تھے
تعلیم و ملازمت	گھر پر ابتدائی تعلیم، پھر سرکاری مدرسوں میں نصابی تعلیم حاصل کی۔ طالب علم کی حیثیت سے ممتاز نہ تھے۔ علم کا فطری شوق تھا۔ بطور خود عربی، فارسی، انگریزی کتابوں کا مطالعہ کیا اور علمی استعداد میں اضافہ کیا۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں مختاری کے امتحان میں بیٹھے اور اول آئے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور ایک سال بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں مسل خواں ہو گئے۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں وکالت کی سند حاصل کی اور ایک سال تک ہائی کورٹ میں وکالت کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ پہلے منصف ہوئے اور پھر قابلیت اور دیانتداری کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کیں۔ سنہ ۱۸۸۸ء میں سب جج اور سنہ ۱۸۹۸ء میں عدالت خفیفہ کے درجہ اول کی ججی کے ممتاز عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں پنشن ہو گئی۔ ۱۹۲۱ء میں اس جہانِ فانی سے

رخصت ہوئے۔

اخلاق و عادات: اکبر نہایت خلیق منکسر المزاج اور مہمان نواز تھے۔ صداقت اور ہمدردی، شوخی اور ظرافت آپ کی طبیعت کے جز ولاینفک تھے

اعزاز و خطاب: جوڈیشیل سروس کے حسن خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے آپ کو خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ ادبی حلقوں میں "لسان العصر" کی حیثیت سے ملک گیر ناموری حاصل کی۔

کتابیں:- اکبر کے کلام کے تین مجموعے کلیات اکبر کے نام سے شائع ہو کر خوب مقبول ہوئے۔ دو مجموعے تو اکبر کی زندگی میں شائع ہوئے۔ تیسرا مجموعہ وفات کے بعد چھپا۔

یادِ اکبرؒ [۵۱]

(۱۵)

الہ آباد ابھی اسی مارچ میں وسط ماہ کے بعد جانا پڑا تو قیام کے لئے انتخاب
عشرت منزل کا کیا۔ عشرت منزل کسی رئیس کے عشرت کدہ کا نام نہیں۔ اردو کے مایہ ناز شاعر
اور حکیم اور عارف حضرت اکبر کے کاشانہ کا لقب ان کے فرزند اکبر سید عشرت حسین کے نام
پر ہے۔ ۳۴ سال کے بعد اس مبارک احاطہ میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا۔ آخری
مرتبہ اس میں قیام جولائی ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا وہی حضرت اکبر کی وفات سے چند مہینے
قبل۔ اللہ اکبر! اس ۳۴ سال میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ اور خیالات کی دنیا میں
کیسے کیسے بھونچال آچکے! جب کے جوان آج کے بوڑھے ہیں، اور جو بلبل خوش
نوا اس وقت زندہ تھا چہک رہا تھا وہ آج خاموش گوشہ لحد کو آباد کئے
ہوئے ہے۔ مکان کے در و دیوار سب وہی، وہی کمرے، وہی صحن، وہی جنوب کے
کے رخ پر لمبا چوڑا برآمدہ، جہاں آرام کرسی پر حضرت اکبر بیٹھے یا لیٹے حقہ پیتے
رہتے۔ اور دہن مبارک سے برابر شعر و حکمت کے پھول جھڑتے رہتے! یہیں
ہر روز بار بار نمازیں ہوتیں اور کثرت سے تلاوت قرآن ہوتی رہی

اکبر کوئی رند و لاابالی قسم کے شاعر نہ تھے۔ صحیح معنی میں طالب علم تھے اپنی
طالب علمی پر فخر کرتے۔ اچھی خاصی عمر کو پہنچ کر ایک عالم کو تنخواہ دے کر ان سے
عربی سیکھی اور دینی کتابیں پڑھیں انگریزی میں فلسفہ وغیرہ کی بھی اونچی کتابوں کا
مطالعہ جاری تھا۔ نظر وسیع تو بہت تھی لیکن عمیق خوب تھی۔ اب جو کتاب بھی پڑھتے

---

۵۱ صدق لکھنؤ ۹/ اپریل ۱۹۵۵ء میں سچی باتیں کے عنوان سے

اس کا ست یا جوہر ہیئے۔ فرماتے تھے کہ روز جب رات کو سونے لیٹتا ہوں تو جائزہ
لیتا ہوں کہ آج دن بھر میں نیا علم کون سا حاصل ہوا۔ جس دن کوئی نئی بات نہیں ملتی
تو یہ کرتا ہوں کہ اس وقت پھر اٹھ کر الماری سے لغت کی کوئی کتاب اٹھا لیتا ہوں اور
کوئی ایک نیا لفظ یاد کر لیتا ہوں اور کچھ نہیں تو ایک نئے لفظ ہی کا علم حاصل کر لوں اور
دن بالکل بے کار تو نہ جائے۔ ۔ کیا ٹھکانہ ہے اس ذوق علم کا! اچھے جید طلبہ میں بھی
اس کی مثالیں کہاں ملیں گی۔

عمل علم سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ نماز کے گویا عاشق تھے۔ وقت آنے کے بہت
بیشتر سے وقت آنے کے انتظار میں رہتے، گھڑی دیکھتے رہتے۔ اول ہی وقت نماز پڑھ
لیتے۔ نیا ملازم رکھتے تو اس میں شروع ہی میں کہہ دیتے کہ نماز ساتھ ہی پڑھنا ہوگی
تلاوت قرآن کے بھی ایسے ہی شائق تھے۔ روزانہ دو وقت پابندی سے کرتے بعد فجر اور
بعد ظہر فرماتے تھے کہ مجھے جو کچھ عربی آ گئی قرآن مجید بار بار پڑھتے رہنے سے آ گئی گفتگو
آخر زمانہ میں گویا دو موضوعوں پر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک توحید دوسرے
آخرت۔ باتیں اور بھی کرتے۔ آخر یہی دنیا کے آدمی تھے۔ ہنستے ہنساتے بھی جاتے لیکن
ہر چند منٹ بعد کوئی نہ کوئی پہلو ذکر توحید کا ضرور نکال لیتے اور اپنے اللہ کی تحمید
و تمجید کرنے لگ جاتے بزرگوں کا ذکر بھی دیر تک بغیر اللہ میاں کا ذکر لائے
نہ سن سکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی نعتیہ مضمون چل رہا ہو تو ذرا دیر کے بعد اس
طرح کے مصرعے ضرور بول اٹھتے کہ جی ہاں ہمارے اللہ میاں کی کاریگری کا کیا کہنا
ایک بندہ میں ایسے کمالات جمع کر دئے۔ اور توحید کے بعد ہی جو محبوب موضوع
گفتگو تھا وہ فنا و آخرت کا۔ قال بھی یہی رہ گیا تھا اور حال بھی یہی ——
کہتے ہیں کہ آخری وقت ڈوبتی نبض ایک بار پھر ابھر آئی، جب تیمارداروں نے پکار
کر کہا "لا موجود الا اللہ"